WACE'S CHRISTIANITY AND MORALITY.

مسیحی دین اور اخلاق

مصنفہ

پادری ہنری ویس صاحب ڈی۔ڈی

مترجمہ

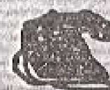
پادری جے علی بخش صاحب

پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی

انارکلی لاہور

سنہ ۱۹۰۵ء

بار اول تعداد ۱۰۰۰ P. R. B. S., LAHORE. قیمت ۸/



54416
54557

فہرست مضامین

مسیحی دین اور اخلاق

حصہ اوّل

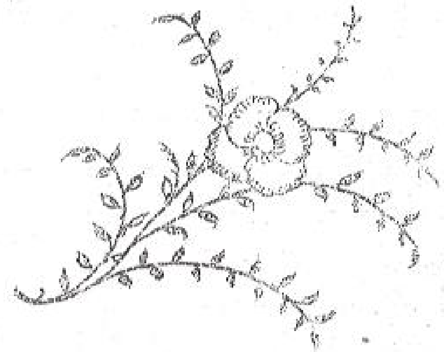
تمہید

مضامین کے اس سلسلہ کا مقصد یہ ہے کہ مسیحی عقیدے کے بارے میں جو شہادت انسان کی اخلاقی ذات یا طبیعت سے ملتی ہے اُس کو ظاہر کرے اور اُس میں ایسے لوگوں کے اعتراضوں کا جواب دیا گیا ہے جو اخلاق کے اعلےٰ فرض کو تو مانتے ہیں لیکن اس امر کا انکار کرتے ہیں کہ مسیحی دین سے کوئی خاص مدد اخلاقی امور میں مل سکتی ہے۔ اس لئے مصنف نے پہلے یہ بیان کیا ہے کہ ہم کو حق اور ناحق کی پہچان حاصل ہے اور پھر یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ پہچان یا حق و ناحق کی تمیز جو ہمیں حاصل ہے اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ روحانی جہان اور شخص خدا کے ساتھ ہمارا رشتہ ہے اور ہم میں روحانی تقاضے پائے جاتے ہیں۔ مسیحیوں کا یہ دعوےٰ ہے کہ یہ روحانی تقاضے سوائے مسیحی دین کے پورے نہیں ہوسکتے۔ ساتھ ہی مصنف ان غلطیوں کو دور کرنے کی بھی کوشش کرتا ہے جو مسیحی تعلیم کے بارے میں پائی جاتی ہیں اور وہ ظاہر کرتا ہے کہ مسیحی تعلیم

انسانی تمیز اور تجربے کے مطابق ہے ۔

دوسرے سلسلے میں خاص کر ان لوگوں کو جواب دیا جائیگا جو خدا کی شخصیت کے قائل نہیں اور نہ مانتے ہیں کہ خدا سے کسی خرق الفطرت مکاشفہ ملنے کا امکان ہے ۔

پس پہلے حصے میں مسیحی تعلیم کی اخلاقی و روحانی حقیقت ظاہر کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں ان ابتدائی اصولوں کی پختگی جن پر تعلیم مشتمل ہے ۔



لیکچر اوّل

"میں انجیل کے سبب سے شرمندہ نہیں ہوتا ۔ اس لئے کہ وہ ہر ایک ایمان لانے والے کے واسطے پہلے یہودی پھر یونانی کے واسطے خدا کی نجات بخش قدرت ہے" (رومیوں ۱: ۱۶) ۔

ان لیکچروں کے بانی کا منشا یہ تھا کہ جو جھگڑے خود مسیحیوں کے درمیان ہوتے ہیں ان سے کنارے رہیں اور دہریہ ۔ موحد ۔ بت پرست یہودی محمدی لوگوں کے مقابلے میں سچے دین کو ثابت کریں ۔ اس لئے اوّل یہ دریافت کرنا چاہیئے کہ بے ایمانی کی کون سی مختلف صورتیں ہیں جن کے خلاف مسیحی دین کو ثابت کرنا ضرور ہے ۔

ہر پشت و زمانہ میں خاص خاص مشکلات و خطرات ہوا کرتے ہیں اس لئے ان لیکچروں میں ایسی دلائل دی گئی ہیں جو مختلف زمانوں کی ضرورتوں کے مطابق ہو سکیں ۔ جوں جوں روئے زمین پر تجارت بڑھتی جاتی اور مسیحی قومیں پھیلتی جاتی ہیں مسیحی دین کا تعلق جہان کے دیگر مذاہب سے زیادہ دلچسپی پیدا کرتا جاتا ہے ۔ دوست و دشمن سب یہ مانتے ہیں کہ مسیحی دین کو اندرونی خطرہ ہے یعنی نہ بت پرستوں، محمدیوں اور یہودیوں سے خطرہ بلکہ مشہور فلسفوں سے ۔ یوروپ کے مشہور سائنس والوں سے اور دور بین نکتہ چینوں سے ۔ ایسے مصنفوں نے تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ سوسائٹی کا مسیحی عقیدہ کچھ ہلا دیا ہے ۔ بہت سے شکوک مسیحی دین کے بارہ میں پیدا کر دیئے ہیں ۔ ایسی تاثیریں نہ صرف مسیحی دین

بلکہ مسیحی تہذیب کا رس چوس رہی ہیں +

بشپ بٹلر صاحب اپنی کتاب تشبیہ کے دیباچہ میں فرماتے ہیں:۔
"میں نہیں جانتا کہ کس طرح سے لیکن بہتوں نے یہ امر تسلیم کر لیا ہے کہ
مسیحی دین اس قابل نہیں کہ اس کی تحقیقات کی جائے کیونکہ آخرکار یہ
فسانہ ظاہر ہوا ہے۔ اور موجودہ زمانہ میں وہ اس پر ایسی طرح سے نظر
کرتے ہیں کہ گویا سب اصحاب فہم نے اتفاق رائے کر لیا ہے کہ مسیحی دین
سوائے اس کے اور کسی مصرف کا نہیں کہ وہ ہنسی ٹھٹھے کا نشانہ بنایا
جائے تاکہ اس سے انتقام لیا جائے کہ اس نے اتنے عرصے تک جہان
کی عشرتوں میں خلل اندازی کی تھی"۔ بٹلر صاحب کے زمانہ میں تو اخلاقی
فرائض پر بھی شک ڈالا جاتا تھا اور اب بھی بعض ایسے مباحثے ہوتے ہیں۔
لیکن ہمارا مقابلہ ایسے لوگوں سے ہے جو مسیح کی اخلاقی تعلیم کو مان لیتے
اور اس کی عظمت کے قائل ہیں بلکہ اس اخلاقی تعلیم کو مسیحی دین کا لب
لباب سمجھتے ہیں۔ مگر وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ایسے سادہ اور عمدہ مکاشفہ
کو پولوس اور دوسرے مسیحی عالموں کے خیالات نے دبا کر دھندلا کر دیا ہے
چنانچہ ایک مصنف میتھیو آرنلڈ صاحب کہتے ہیں کہ یونانیوں اور لاطینیوں
نے غیر الٰہی عقل کے سادہ ذہنی خیالات کو تاریک کر دیا ہے۔ یہ مصنف
ایسی ازلی قوت کا ذکر کرتا ہے جو آخرکار راستبازی پیدا کرتی ہے۔ ایک
دوسرے مشہور مصنف گریگ صاحب کہتے ہیں کہ "میرا مقصد صرف یہ
ہے کہ میں اس اعلیٰ سادہ عقیدے کو ظاہر کروں جو مسیح کی سادہ تعلیم اور
نمونہ میں پایا جاتا ہے۔ مسیح کے اخلاقی نمونے پر کوئی بھلا مانس الزام نہیں
لگاتا اس کی سیرت تعلیم و تقلید کے لئے اخلاقی معراج سمجھا گیا ہے"۔

ہم کو اب ایسے آدمیوں سے واسطہ آپڑا ہے جن کے درمیان یہ
خیال پھیلا ہوا ہے کہ اگر ایمان لانا ممکن ہوتا تو وہ ایمان بھی لے آتے۔ وہ
کہتے ہیں کہ مسیحی مکاشفہ یعنی مسیحی عقائد تثلیث، تجسم، کفارہ وغیرہ لوگوں کی
عقل اور اخلاقی طبیعت رد کرتی ہے۔ ان کے خیال میں یہ ہے کہ اگر ہم اپنے
فرائض کو ٹھیک طور سے ادا کریں تو ہم نے جہان پر گویا غلبہ پالیا۔ پس خطرہ
ایسے لوگوں سے نہیں جو ایمان نہ لانے پر خوش ہیں بلکہ ایسے لوگوں سے
جن کی دلی آرزو یہ ہے کہ سچائی کو جانیں اور اس کی پیروی کریں +

اگر راستبازی مسیحی دین کے بغیر حاصل ہو سکتی اور قائم رہ سکتی ہے تو
شاید یہ سوال پیدا ہو کہ پھر مسیحی تعلیم کی کونسی کلی ضرورت باقی رہتی (یعنی مسیحی تعلیم
جو ہماری کلیسیا سکھاتی ہے نہ بعض عالموں کی تعلیم) یہ تعلیم ہمارے عقائد
اور مستند کتابوں میں بیان ہوئی ہے۔ چونکہ یہ حملے لاپرواہ بے دینوں کے
نہیں بلکہ ان کی طرف سے ہیں جن کی نیتیں اچھی اور کوششیں بے ریا
ہیں۔ اس لئے حملے کی شدت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی مشکل
کچھ گھٹ بھی جاتی ہے کیونکہ مخالف بھی ہماری طرح مسیحی دین کی اخلاقی
تعلیم کو مانتے ہیں۔ ہم ایک ہی میدان میں کھڑے ہیں۔ اس مشترکہ
عقیدہ یا میدان سے ہم بحث شروع کریں گے +

آج کل کی بے دینی کی کئی خاص صورتیں ہیں اس لئے ان کی
تردید کے لئے دلائل بھی کئی اقسام کے چاہئیں۔ مثلاً (۱) سائنس کے
بعض مسائل کے زور پر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ اعجازی واقعات جن
پر مسیحی عقیدہ مبنی ہے۔ سائنس کے نتیجوں کے خلاف ہیں (۲) بعض فلسفی
دلائل کے زور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ خدا کا حقیقی علم ہو نہیں سکتا۔

جب تک اس قسم کے اعتراضوں کا جواب نہ دیا جائے تب تک ایسی ایک طرفہ دلائل کا یہ نتیجہ ہوگا کہ ہماری آرزوں اور علم اور ہماری احتیاجوں اور قابلیتوں کے مابین ایک اتھاہ گڑھا رہیگا۔

مسیحی عقیدہ تواریخی بنیاد پر قائم ہے۔ اگر یہ بنیاد ہل جائے تو ہمارے ایمان کی بنیاد ایسی دلائل کے ذریعے قائم نہ رہیگی جو ہماری فطرت کے تقاضاؤں سے نکالی جاتی ہیں۔ جو شہادت ہمیں ایمان لانے پر گویا مجبور کرتی ہے وہ دو قسم کی ہے (ا) شہادت ایسی ہونی چاہئے جو ہمیں کسی امر کے ماننے پر گویا مجبور کرے یعنی معتبر شہادت ہو (ب) ایسے امر کی شہادت ہو جس کا امکان ہے پس شہادت کا اعتبار اور واقعہ کا امکان جب تک دونوں دل جائیں ہم قائل نہیں ہوسکتے۔ یعنی معتبر شہادت ہو اور جس امر کی شہادت ہے اُس کا امکان ہو۔ علاوہ ازیں اگر کوئی یہ ثابت کرسکے کہ انسان کی اخلاقی ذات کی نہایت اعلےٰ ضروریات ان اعجازی واقعات کے بغیر پوری ہوسکتی ہیں جن کا ذکر مسیحی عقائد اور مسائل میں ہے تو اُس شہادت کی جن پر یہ اعجازی واقعات مبنی ہیں اور بھی کم پروا کی جائے گی لیکن اگر برعکس اس کے یہ ظاہر ہو جائے کہ صرف یہی مسائل ہماری اخلاقی و روحانی ذات کے تقاضاؤں کو پورا کرسکتے ہیں تو ان کے ماننے میں جو دقتیں ہیں وہ بہت گھٹ جائینگی۔

جن کے ساتھ ہمارا واسطہ آپڑا ہے وہ مانتے ہیں کہ حق کا ناحق پر بول بالا ہوگا ہے اور موجودہ جہان کے قوائد اور ضروریات اس حق کا معیار ہیں۔ بعض اس خیال پر حقارت سے نظر کرتے ہیں کہ راستبازی کسی طرح خدا کی شخصیت میں ایمان لانے پر مبنی ہے۔ اس سے خواہ مخواہ یہ نتیجہ نکلتا کہ ایسے وجود

کے سامنے شخصی تلافی یا معاوضہ یا وسیلۂ رضامندی پیش کرنا محض وہم اور وسواس ہے۔ اس سے کفارہ و راستباز ٹھیرنے کی اصولی تعلیم کے عملی معنے اُڑ جاتے ہیں تثلیث کا مسئلہ محض خیالی اور وہمی بن جاتا ہے۔ اس رائے والے کم تعلیم یافتہ لوگ کچھ اس طور پر بحث کرینگے "مجھے یقین ہے کہ خدا نیک ہے اور ضرور اُس کے پاس جانے کا ایک ہی طریقہ نہ ہوگا بلکہ بہت طریقے ہونگے۔ اگر یہی ایک طریقہ ہوتا تو وہ زمانوں سے سارے جہان پر پھیل گیا ہوتا۔ جب میں دیانت دار ہوں۔ تمیز کے مطابق چلتا ہوں اور نیکی کے اعلےٰ نمونہ کی پیروی میں جد و جہد سے کرتا ہوں تو میں کیوں اُس کی نظر میں مقبول نہ ٹھیروں گا۔ ہم ایسے بہت گناہوں کے لئے جوابدہ نہیں ٹھیر سکتے جو ہمارے طبعی میلان سے سرزد ہوتے ہیں۔ اگرچہ ہم آزاد مرضی رکھتے اور فعل مختار ہیں تو بھی ہم اس قدر مختار نہیں جتنا بعض سمجھتے ہیں اور اگر کوئی یہ محسوس کرے کہ جس طریقہ سے بائبل کہتی ہے اگر خدا ہمیں سزا نہ دے تو بے انصافی ہوگی تو میں نہیں کہتا ہوں کہ اس بے انصافی کا علاج ایک کامل معصوم شخص کی قربانی سے کس طرح ہوسکتا ہے"۔ اس قسم کی بے اعتقادی آج کل پھیلی ہوئی ہے۔ مسیحی مسائل کا نہ صرف انکار کیا جاتا ہے یا اُن پر حملہ کیا جاتا ہے بلکہ اُن کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ آج کل کے فلسفہ کے آگے یہ بڑھیا کی کہانیاں ہیں جن کو لوگ کبھی دلچسپی سے سُنا کرتے تھے۔ الغرض خواہ یہ مسائل سچ ہوں یا جھوٹ پر ایک بات کا انکار نہیں کرسکتے کہ یہ عقائد اور مسائل انسانی خیال میں زبردست انقلاب اور انسانی اعلےٰ اولوالعزمیوں کا باعث ہوئے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ جب سے اس مذہب کی اشاعت ہوئی

اور یہ خیال آتا ہے کہ جو مصنف دین کی پاکیزگی کا بیڑا اٹھائے وہ ایسی باتیں پیش نہ کریگا۔ لیکن امور واقعی کو کس طرح چھپائیں یہ تو امر واقعی ہے۔ کہ مسیحی تھیالوجی (علم الٰہی) بہت طالبانِ حق کی نظر میں لایعنی ٹھیر گئی ہے افسوس یہ ہے کہ بعض مسیحی دینی عالموں نے اور فرقوں نے عہدِ جدید کی اعلٰے صداقتوں کو تنگ و تاریک کرنے میں بہت کچھ مدد دی ہے اکثر اوقات ایسے لوگوں نے نجات کے بارہ میں سخت انتظاموں کو پیش کر کے اپنے تئیں سنگدل بنا لیا اور ان انتظاموں کو اپنے خیالات کی سطح پر اُتار لائے لیکن یاد رہے کہ عقیدے اور نماز کی کتابیں اور سب سے بڑھکر مقدس نوشتوں کی عبارت جس کی تفسیر کہ یہ عقیدے اور کتابیں کرتی ہیں الگ بنیاد پر قائم ہیں اور چاہیئے کہ ان پر بے طرفدارانہ اور بے غرضانہ غور و فکر اور رائے زنی کی جائے ۔

پس مسیحی دین کے حامیوں کی التماس زمانۂ حال کے مخالفوں سے یہ ہے کہ پیشتر اس سے کہ وہ مسیحی دین کو قطعی طور پر رد کریں وہ ذرا مسیحی تعلیم کے سمجھنے کی کوشش کریں۔ اے مخالفو۔ تم کہتے ہو کہ یہ مسائل متروک ہیں اور اگر انہیں مردہ نہ کہیں تو یہ کہیں گے کہ ہمیشہ کے لئے ان پر فتوے ہو چکا ہے۔ اگر ایسا ہی ہو تو بہرحال چاہیئے کہ وہ روشنی میں مریں نہ تاریکی میں۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ ان مسائل کو پورے طور سے ہم حل کر سکتے ہیں لیکن یہ تو یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ جو معنی ان مخالفوں نے اُن کے سمجھے ہیں اُن سے کہیں اعلٰے ان کے معنے ہیں۔ یہ زیادہ گہرے نتیجے اور انسانی ذات سے زیادہ عمیق تعلق رکھتے ہیں کہ ان معترضوں کا خیال وہاں تک نہیں پہنچا۔ اگر اس سے ہم قطع نظر کریں تو نہایت وسیع و اعلٰے انسانی تجربے کو ہم بے قدر کرینگے

تب سے نوع انسان کی ترقی اور یہ لازم ملزوم ہو گئے ہیں اور اس نے اُن قوموں کو تہذیب کے سانچے میں ڈھال دیا ہے جن پر آئندہ کی ساری اُمیدیں موقوف ہیں۔ یہ کہنا تو آسان ہے کہ نا ورث کا مسئلہ یا استثنا ٹھیرنے کی تعلیم ایک وقت محض نامبش رائے تھیں مگر اس امر کا کون انکار کر سکتا ہے کہ اپنے زمانہ میں اعلٰے سے اعلٰے اشخاص نے ان کو مانا ان کی جدوجہد میں اس تعلیم نے حصہ لیا یہ مسائل اُن کے لئے صحیح و درست تھے خواہ دوسروں کے نزدیک نہ ہوں ۔

فی الحقیقت کسی نہ کسی طرح سے یہ حالت ہوئی ہے کہ بعض اہل فکر اور ذوی عقل اشخاص نے کبھی مسیحی تعلیم کو اُلٹا سمجھا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس تعلیم کے حقیقی معنوں سے بالکل ناواقف ہیں۔ مثلاً ایک مشہور عالم نے یوں کہا ہے کہ "جو عظیم الشان سادہ عقیدہ مسیح نے صاف صاف الفاظ میں بیان کیا اُس میں اس نے ابدی زندگی ان کی میراث ٹھیرائی جو خدا کو اپنے سارے دل سے اور اپنے پڑوسی کو اپنے جیسا پیار کرتے ہیں۔ جو زندگی بھر پاکیزگی فروتنی اور فیض رسانی کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ مسیحی فرقے اور آج کل کی کلیسیائیں اپنی نماز کی کتابوں اور عقائد ناموں میں اس تعلیم کو طفلانہ اور متروک سمجھے بیٹھے ہیں۔ نجات کے حاصل کرنے کا وسیلہ بالکل بدل گیا ہے۔ ابدی زندگی صرف اُن کا حق بتائی گئی ہے جو بعض عالموں کے اختراع کردہ خاص خاص جملوں اور لفظوں کو قبول کرتے اور اُن کا اقرار کرتے ہیں"۔ اگر کوئی عام یا لاپروا مصنف اس قسم کا بیان کرتا تو قابل توجہ نہ ہوتا۔ صاحب علم و فکر یہی جانتے ہیں کہ ایسے بیانات نے انجیل کے حقیقی مکاشفہ کو ایسا لباس پہنایا ہے جس سے خواہ مخواہ ہنسی آتی

میں ان باتوں کی دلائل لاؤں گا نہ محض ایک عقیدے کا اشتہار دوں گا یا محض نصیحت پر اکتفا کرونگا۔ یہ تو واقعی بات ہے کہ ان صداقتوں نے انسان کی روح کو زیادہ عمیق اور پُر محبت رشتہ میں گانٹھ دیا ہے۔ جو کسی دوسرے انسان کی تاثیر سے نہ ہو سکتا تھا۔ آگستین معلّم فصاحت ہو سکتا تھا لیکن وہ گہرے اور شریف جذبات جو اُس کی کتاب اقرارات میں پائے جاتے ہیں مسیحی تعلیم کا نتیجہ ہیں۔ تو تحقّر کا بچہ کی طرح ہونا اور اُس کا ایمان اس کے دینی عقیدہ کا نتیجہ تھا۔ پس ایسے مسائل کی خوبی اور اُن کے معنے ان لکچروں میں ظاہر کئے جائینگے اور مخالفوں کو ان ہی باتوں کے زور پر جواب بھی دیا جائے گا۔ جن کو وہ پورے طور سے مانتے ہیں۔ خدا کی رُوح ہمارے خداوند یسوع مسیح کے وسیلے اس کوشش میں مدد کرے ۔

لکچر دوم

علّت خالق یا تقاضائے رُوح

"مبارک ہیں وہ جو غریب دل ہیں کیونکہ آسمان کی بادشاہت ایسوں ہی کی ہے" (متی ۵: ۳) ۔

لکچروں کے موجودہ سلسلہ میں جس جگہ سے مجھے بحث شروع کرنا ہے اُس کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ ہم اور وہ جو مسیحی دین کی نسبت شک رکھتے یا اُس کا انکار کرتے ہیں اس امر پر متفق ہیں کہ اخلاق اعلیٰ فرض ہے۔ دین سے قطع نظر کرکے بھی یہ امر مسلّم ہے کہ حق ہے اور ناحق ہے۔ حق سب سے

اعلیٰ اور ناحق سب سے ادنےٰ ہے۔ اور جن سے میں مخاطب ہوں وہ مانتے ہیں کہ حق کو ناحق پر ترجیح دینی چاہئے خواہ کیسا ہی نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ اور اگرچہ ناحق پر ظاہراً کچھ خرچ بھی نہیں ہوتا۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس امر کے تسلیم کر لینے میں کیا کیا کچھ شامل ہے۔ اگر ہم اس کے نتائج کا تہ تک سُراغ لگائیں تو کیا یہ مسیحی دین کی طرف اشارہ نہ کریگا کہ صرف یہی اُس کے تقاضے پورے کر سکتا ہے ۔

پہلے میں اُن مختلف خیالات کا ذکر کرونگا جو حال کے سائنس والوں کے بالعموم حسِ اخلاقی کے آغاز و تکمیل اور بالخصوص اخلاق کے بارہ میں ہیں۔ ایسی تحقیقات کا آخر میں خواہ کچھ ہی نتیجہ نکلے لیکن اس میں کسی کو کچھ کلام نہیں کہ نوع انسان کے قوٰے و تصورات اخلاقی بعض اہم امور میں بتدریج نشو و نما پا چکے ہیں۔ اس امر کی تحقیقات میں کہ کن اصلی بیجوں سے یا چشموں سے اس نشو و نما کا آغاز ہوا سائنس سے مدد ملتی ہے۔ ابھی تک شاید ہم اس بات کے سمجھنے میں بہت قاصر رہے ہیں کہ کیسے وسیع معنوں میں یہ جملہ ہماری ذات پر صادق آتا ہے کہ "ہم خاک سے لئے گئے ہیں"۔ (واعظ ۳: ۲۰)
البتہ یہ دو باتیں الگ الگ ہیں۔ اوّل یہ کہ فلاں شے کن کن چیزوں سے مرکب ہے یا کس طریقہ سے اس نے نشو و نما پایا دوم وہ شے اپنی مکمل و مرکب حالت میں۔ بعض اوقات اوّل اُن کے جاننے سے دوسرے کی یا دوسرے کے جاننے سے پہلے کی توضیح نہیں ہوتی۔ مثلاً پانی دو گیسوں سے مرکب ہے جو ایک خاص اندازے سے مل کر پانی بن جاتی ہیں لیکن ان دو گیسوں کی غیر مرکب حالت میں جو صفات ہوتی ہیں اُن سے پانی کی صفات کا کچھ خیال قائم نہیں کر سکتے۔ الٰہی انتظام سے یہ دو گیسیں مل کر آناً فاناً پانی بن

جاتی ہیں جس کے فوائد تعلقات خواص اپنے دو عناصر سے بالکل متفرق ہوتے ہیں۔ ان عنصروں کا علم اس لئے تو مفید ہے کہ ہم ان کو کس طرح سے ملا کر پانی بنالیں۔ لیکن مرکب حالت میں جو فوائد وخواص اس میں پیدا ہوجاتے ہیں وہ اصلی گیسوں کی حالت سے بالکل الگ ہیں۔ ویسا ہی انسان کی اخلاقی ذات کے عام معنی کا لحاظ کرتے وقت اُن مختلف راہوں میں اپنے تئیں نہ اُلجھائینگے جو اس ذات کے نشوونما کے بارہ میں پیش کی گئی ہیں بعض فیلسوف اس نشوونما کا باعث (۱) تمدنی تاثیریں ٹھیراتے ہیں (۲) بعض عقول عارضی پر عقول مستقل کی فوقیت کو اس کا سبب بتاتے ہیں (۳) بعض استفادہ یا اُمید نفع وفائدہ اس کا باعث سمجھتے ہیں (۴) بعض کہتے ہیں کہ مذکورہ بالا تینوں اسباب اس کی وجہ ہیں۔

مگر ہماری اخلاقی ذات بعض ایسے واقعات وتعلقات کو پیش کرتی ہے جو فی الحقیقت موجود ہیں۔ اور سارے عملی مقاصد کے لئے ان راہوں پر ان کا کچھ اثر نہیں۔ ہم میں خواہشیں ہیں اور ہمارے فرائض ہیں جن کو پورا کرنا ضرور ہے۔ کچھ مضائقہ نہیں کہ وہ کس طرح سے پیدا ہوئے اپنی زندگی کے مقاصد کے لئے ہمیں اُن کو امور واقعی ماننا چاہیئے بلا اس تفتیش کے کہ ان کا آغاز کس طرح سے ہوا۔ اکثر عالموں نے یہ غلطی کی ہے کہ جب انہوں نے کسی خیال یا شے کے اجزائے مرکبہ کو معلوم کرلیا تو انہوں نے سمجھ لیا کہ جو کچھ ہمیں اس کی بابت جاننا چاہیئے تھا وہ ہم نے جان لیا حالانکہ شے اپنی مرکب حالت میں اپنے اجزا کی مفرد حالت سے بالکل متفرق ہے۔

پس جہاں تک اس کتاب کا منشا ہے ہم ان راہوں سے بلا ان کی بے وقری کئے قطع نظر کرسکتے ہیں۔ سائنس ایسے مضامین کے متعلق متبدل

وغیر مستقل حالت میں ہے اور اُس کے آخری نتائج قائم ہونے تک ٹھیرے رہنا مشکل ہے۔ لیکن انسانی ذات کے خاص واقعات وخاص حاجات ایسی متبدل وغیر مستقل ہیں۔ اس لئے جب مسیحی اشخاص لوگوں کے سامنے یہ بات پیش کرتے ہیں کہ ہمارے نزدیک حق وناحق کے اس وقت کیا معنی ہیں اور جن اخلاقی فرائض اور روحانی تقاضوں سے وہ واقف ہیں وہ کون سے ہیں تو وہ ایک پختہ بنیاد پر بولتے ہیں۔ قانون جر ثقیل یا قانون کشش کے دریافت ہونے سے پیشتر نظام شمسی کے خاص بڑے واقعات معلوم تھے۔ حالانکہ اب اس قانون کو دریافت ہوئے تقریباً دو صدیاں گزر چکی ہیں تو بھی اب تک اس کے اجزائے مرکبہ وتکمیل کے بارہ میں ہم بہت کچھ ناواقف ہیں۔ ویسا ہی اُن تعلقات ورشتوں کا جو رُوح کے ساتھ ہیں ہم ٹھیک مطلب معلوم کرسکتے ہیں اگرچہ رُوح کے کام ونشوونما کے فلسفی قانون اب تک مشتبہ حالت میں ہیں۔ ہم نے شروع ہی میں فلسفہ کو یہ عزت دے چھوڑی ہے۔ اب مابعد تحقیقات میں ہم زندگی کے معمولی واقعات سے واسطہ رکھینگے معمولی زبان استعمال کرینگے اور یہ سمجھینگے کہ ہم انسانی ذات کا نہیں بلکہ خاص انسانی وجود واشخاص کا ذکر کر رہے ہیں۔

حق وناحق کی تحقیقات خاص دو حصوں پر منقسم ہے اول حق وناحق کا خیال یا تصور۔ دوم حق کیا ہے اور ناحق کیا ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیں کہ ایک تو عام اعلےٰ اصول ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ میں حق پر چلنے کے لئے پابند ہوں۔ دوسرا ادنےٰ اصول کہ یہ یا وہ امر حق ہے پس اخلاق کے فرض اور اخلاق کے معیار پر الگ الگ غور کرنا چاہیئے۔ ہاں یہ تو ہوسکتا ہے (مسیحی خیال کے بموجب) اگر ہم ایک کا جواب دیں تو وہ دوسرے کا

بھی جواب ہوگا۔لیکن زندگی کے امورِ واقعیہ میں ان کے درمیان امتیاز کرنا چاہئے۔انہیں امورِ واقعیہ سے ہم بحث شروع کرتے ہیں۔آدمی کے لئے یہ تو حق ہے کہ وہ اپنے کانشنس یا تمیز کے مطابق چلے۔لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ چونکہ وہ ایسا عمل کرتا ہے اس لئے وہ عمل بذاتِ خود حق ہے۔برعکس اس کے بعض اشخاص نے اپنی تمیز کے مطابق عمل کرتے ہوئے ایسے کام کئے ہیں جن کی نسبت ہر کوئی کہے گا کہ انہوں نے اخلاق کے معیار کو توڑا ہے۔اگر ایسے اشخاص کا یہ یقین و ایمان تھا کہ جو وہ کر رہے ہیں وہ اُن کا عین فرض ہے تو ہم ان شخصوں کو تو مجرم نہ ٹھہرائیں گے لیکن ان کے افعال کو ضرور مجرم ٹھہرائیں گے۔انہوں نے اپنی ذات کے اعلیٰ اصول کی پیروی کی۔اگرچہ تعصب یا عدمِ تعلیم کے ذریعے اُس دوسرے اصول سے فائدہ اُٹھانے میں سخت غلطی کی۔ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی اپنے علم کے مطابق عمل کرے تو بھی جو کچھ کرے وہ درست نہ ہو۔ایک معنی میں وہ حق کر رہا ہے لیکن دوسرے معنی میں وہ ناحق کر رہا ہے۔اس سے مقدس نوشتوں کے بعض مقامات کی کافی تشریح ہوتی ہے کہ بعض آدمیوں کی تعریف ایسے افعال کی وجہ سے ہوتی ہے جو بذاتِ خود قابلِ تعریف و حمایت نہ تھے۔بہرحال ان مثالوں سے یہ تو بخوبی واضح ہو گیا کہ حق پر چلنے کا فرض جان لینا اَور بات ہے۔حق و ناحق کے حقیقی معیار کو معلوم کرنا اَور بات ہے۔

بلحاظ پہلے سوال کے اخلاق کے اعلیٰ معنی میں اس کا خاص ذکر دوسرے حصہ میں ہوگا۔اب ہم دوسرے سوال کو پہلے لیتے ہیں جس طریقہ سے ان عالموں نے اس کا ذکر کیا ہے ویسا ہی ہم کریں گے یعنی

یہ کہ انسان کے دل کی غائت تمنا کیا ہے۔میں اسے زندگی کا غائت مقصد تو نہیں کہتا کیونکہ ایسا کہنا تو ہماری فطری عقل کی رسائی سے پرے ہے۔لیکن رُوح کی غائت تمنا کا پورا مشاہدہ تو کر سکتے ہیں اور یہ نتیجہ نکالے بغیر بھی نہیں رہ سکتے کہ جو طریقہ اور فعل اس تمنا کو پورا کرتا ہے وہ ضرور وہی ہوگا جس کی پیروی کرنے کا ہمارا ارادہ ہے۔اس ہی نقطہ سے ارسطو نے شروع کیا اور اسی نقطہ سے اکثر انگریز فیلسوف شروع کرتے ہیں۔

اس سوال کے جواب میں فی الحقیقت بہت اختلاف نہیں۔دو ہزار سال سے زیادہ کا عرصہ گزرا کہ ارسطو نے اپنا رسالہ اخلاق کے بارہ میں اسی سے شروع کیا۔اُس نے بتایا کہ زندگی کا خاص فائدہ یا مقصد خوشحالی ہے زمانۂ حال کے انگریز فیلسوف بھی کچھ تبدیلی کے ساتھ اسی تعریف کو قبول کرتے ہیں۔یہ انسانی جذبات کا اندازہ و تخمینہ ہے اور رسم کو بھی اس سے بہت اختلاف نہیں۔

مسیحی اخلاق پر اکثر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ وہ ہمارے سامنے خودغرضانہ مقاصد پیش کرتا ہے۔حق کی خاطر حق پر چلنے کے لئے نہیں کہتا بلکہ صلہ کی خاطر۔اس کا جواب بھی ارسطو کے اس جملہ سے ملتا ہے کہ نیکی کے خیال کو خوشحالی کے خیال سے جدا نہیں کر سکتے۔جہاں نیکی ہے وہاں خوشحالی ہے۔اگرچہ خوشحالی کا خیال زیادہ وسیع ہے۔مقدس نوشتے پورے طور سے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ خوشی نوعِ انسان کی محض تمنا ہی نہیں بلکہ جائز تمنا ہے۔خدا کے سب حکموں کے ساتھ وعدہ ہے خواہ الفاظ میں ظاہر ہو یا نہ ہو۔خاص لفظ جس سے وعدہ ٹپکتا ہے وہ

مبارک ہے۔ ہاں مبارک بادی یا مبارک حالت خوشی سے کچھ متفرق
تو ہے کیونکہ مبارک حالت اعلےٰ درجہ یا اعلےٰ قسم کی خوشی ہے۔ لیکن موجودہ
بحث میں اس امتیاز کی کچھ ضرورت نہیں۔ پہلا مزمور اور پہاڑی وعظ
اس اصول پر مبنی ہیں۔ پہاڑی وعظ کے آخر میں اس بات کا یقین دلایا
گیا ہے کہ جو کوئی مسیح کے کلام پر عمل کریگا وہ دائمی حفاظت میں رہے گا۔
(متی ۷: ۲۴-۲۷) مسیح کی اخلاقی تعلیم کا رنگ ہی برکت ہے حالانکہ
وہ سب معلموں سے بڑھکر خود انکاری خود قربانی کا معلم ہے۔ وہ یوں اس
خود انکاری کو پیش کرتا ہے "وہ جو اپنی جان بچاتا ہے اُسے کھوئیگا لیکن
وہ جو اپنی جان میری اور انجیل کی خاطر کھوتا ہے وہ اُسے بچائیگا" (مرقس ۸: ۳۵)
یوں خود انکاری کے ساتھ وہ ذاتی نفسی حفاظت کو بھی پیش کرتا ہے۔ انجیلوں
میں مشکل سے کوئی فقرہ ہوگا جس میں خود انکاری کے ساتھ برکت بطور نتیجہ
کے ملحق نہ ہو اور جب رسول نے یہ لکھا "ہم یہ باتیں اس واسطے لکھتے ہیں
کہ تمہاری خوشی پوری ہو جائے" (۱۔ یوحنا ۱: ۴) اس کے دل پر اُس کے
خداوند کی تعلیم سے یہ نقش ہوا۔ (نیز دیکھو فلپیوں ۳: ۷-۹) ان رسولوں کی
زندگی سے ارسطو کی اس تعریف کی تشریح ہوتی ہے کہ خوشی یا خوشحالی رُوح
کی اعلےٰ طاقت ہے۔ لیکن کیا ہمارے دلوں کا تجربہ انسانی جذبات
کے اس اندازہ کی صداقت ماننے پر ہم کو مجبور نہیں کرتا۔ یہ بھی ظاہر ہے
کہ جو گناہ انسان کرتا ہے وہ بھی کسی غلط صورت میں خوشی کی تحصیل و تلاش
کے باعث ہی ہوتا ہے۔ لیکن کیا ہم فی الحقیقت کبھی اس تلاش کو نیکی
کے اعلےٰ تصور سے جدا کرتے ہیں؟ بالفعل جس خود انکاری کو ہم اپنے
پر فرض ٹھہراتے ہیں یا دوسروں کو اس کی ترغیب دیتے ہیں خواہ وہ

کیسی ہی تلخ کیوں نہ ہو اس کی نسبت ہم بخوبی جانتے ہیں کہ حقیقی خوشی
اس کا نتیجہ ہوگا۔ جو یونانی فیلسوف نے کہا ہے میں اُس کا انکار نہیں
کر سکتا کہ نیکی اور راستبازی بذات خود مرغوب طبع ہیں۔ لیکن وہ اس سے
بھی بڑھکر اس لئے مرغوب طبع ہیں کیونکہ ہماری ذات کے تقاضاؤں
کی کامل تشفی کی یہ ضروری شرط ہیں۔ بعض قوموں میں کئی ایسے مشہور شخص
گزرے ہیں کہ وہ اپنے ہم جنسوں سے مایوس ہو کر راستبازی سے چمٹے رہے
اسے اُنہوں نے ایک عمدہ شے سمجھا جسے وہ حاصل کر سکتے تھے اگرچہ ہر ایک
دوسری خوشی کا اُنہوں نے انکار کیا۔ جیسا مزمور نویس نے یہ کہا کہ "تیری
درگاہ میں ایک دن ہزار دنوں سے بہتر ہے" (مزمور ۸۴: ۱۰) رومی شخص بھی
اتنا کہہ سکتا تھا کہ صرف ایک دن جو فلسفہ کی ہدایت کے مطابق خرچ ہو
وہ اُس بقا پر ترجیح رکھتا ہے جو غلطی اور گناہ میں صرف ہو۔ غیر قوموں
کی نیکی کا یہ اظہار اگرچہ بہت عالیشان ہے تو بھی وہ اس میں وہ رُوح افزا
اور اطمینان بخش مادہ پایا نہیں جاتا جس کے باعث مسیحی نیکی متعدی بن
گئی اور شہیدوں نے شکنجہ اور موت کو نہ محض توکّل سے بلکہ خوشی سے
قبول کیا۔ بیشک دوسرے مذہبوں میں بھی شہید گزرے ہیں لیکن مذکورہ
بالا مایوسی کے اظہارات سے قطع نظر کر کے ہر حالت میں وہ شہادت
اس یقین پر مبنی ہے کہ شہادت آرام ابدی کو پہنچاتی ہے۔ پس فرض
اور خوشی لازم ملزوم ہیں۔ ایک کے ادا کرنے پر دوسرے کی تحصیل مبنی
ہے۔ انسان کا یہ عام تجربہ ہے اور مقدس نوشتے بھی اسے پیش
کرتے ہیں۔ ✤

پس مسیحی تعلیم کے لحاظ سے ایسے فلسفہ کو ہم بُرا نہیں کہہ سکتے

جو خوشحالی کو انسانی زندگی کا اعلےٰ یا خاص مقصد سمجھے اور کسی فعل کی خوبی
و بہتری کا اندازہ اسی سے لگا سکتا ہے کہ اُس فعل میں خوشحالی پیدا کرنے
کا میلان کس درجہ تک ہے۔ جو نقص اِس فلسفہ میں ہے وہ یہ ہے کہ
جن تصورات کو یہ مشتمل کرتا ہے اُن کے اطمینان و استغنا میں یہ سخت
قاصر رہتا ہے۔ بعض اوقات تو یہ فلسفہ اُس اعلےٰ سے اعلےٰ خوشحالی کو
جس کی تحصیل کی انسان نہایت وفاداری سے کوشش کرتا تھا ناقابل
تحصیل سمجھکر ترک کر دیتا ہے اور کبھی یہ کہ دیتا ہے کہ شاید اس فلسفہ کے
ماننے والے کسی غیر محدود و آئندہ زمانہ میں اکثروں کو پہنچینگے۔ چنانچہ مل (Mill)
صاحب اپنے ایک رسالہ میں ذکر کرتے ہیں کہ بہت لوگ متوسط درجہ
کی خوشی سے مطمئن ہو جائینگے اور پشتوں کے طول طویل عرصہ میں مصائب
انسانی کے چشمے بہت درجہ تک بعض صورتوں میں بالکل معدوم ہو جائینگے
یہ لوگ مانتے ہیں کہ انسان میں چونکہ اخلاقی اور عقلی مطالبات پائے جاتے
ہیں اس لئے وہ ایک ایسی ہستی کے قابل ہے جس کو ہم قابل رشک
کہہ سکتے ہیں۔ یہ بھی وہ تسلیم کرتے ہیں کہ جہان کے انتظام کی ایک خاص
ناقص حالت میں آدمی اپنی خوشحالی کا مطلق انکار کر کے دوسروں کی
خوشحالی کا بہت کچھ باعث ہو سکتا ہے۔ پس ایسے عالم یہ کہتے ہیں کہ
حق کا معیار آدمی کی اپنی خوشی نہیں بلکہ اُن سب کی خوشی ہے جن سے اُس
کا تعلق ہے۔ پس اگر ایسے تصورات ہی کا خیال کیا جائے تو میں کس منہ
سے اُن پر اعتراض کر سکتا ہوں۔ لیکن میں اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا
ایسے عالم انسانی ذات کی ان حاجتوں کے لئے کوئی کافی اطمینان بھی
پیش کرتے ہیں یا نہیں اور کیا وہ انسانی زندگی کے اس تاریک پہلو کا

کافی علاج کرتے ہیں جس کے دور کرنے کے لئے بقول ان کے بیشمار
پشتیں چاہئیں۔ ہاں یہ بھی یقین کرنا مشکل ہے کہ یہ تعریف جائیں محض
مایوسی کے لئے پیدا کی گئی تھیں اور جب یہ معلوم ہوگا کہ وہ قابل رشک
حالت بعض نامور اشخاص کو اپنی اعلےٰ خوشی قربان کرنے سے ملی ہے تو
اس حالت کی خوشی بھی کرکری ہو جائیگی۔ لیکن یہ فیلسوف جس امر کو نظر
انداز کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس وقت جہان میں جو بہت غم دکھ اور مایوسی
پائی جاتی ہے اُس کا کیا علاج کریں۔ یہ عالم مانتے ہیں کہ پشتوں تک یہی
حالت رہے گی۔ اس سے ظاہر ہے کہ پشتوں تک نوع انسان کے
بڑے حصے کو خوشی نہیں مل سکتی۔ بائبل میں خوشی کا عمیق چشمہ منکشف
ہوا ہے لیکن وہ اس جہان کی خوشی و خرمی نہیں ۞

خیالی اور فیلسوفانہ باتیں تو بہت کرتے ہیں لیکن دیکھنا یہ چاہئے کہ
ہمیں واسطہ کن لوگوں سے پڑتا ہے۔ دیکھنے میں تو یہ آتا ہے کہ ہمارے
چاروں طرف ہزاروں آدمی ہیں جو مایوسی کے گرداب میں پڑے ہیں۔
عزیزوں کی موت کے صدموں سے تلملا رہے اور مصیبتوں کے بوجھ
تلے دب رہے ہیں۔ سارے جہان میں یہی حال ہے۔ پس یہ فیلسوفانہ
تعلیم کہ بیشمار پشتوں کے گزر جانے کے بعد یہ خوشی حاصل ہوگی
ایسے آدمیوں کو کیا تسلی دے سکتی ہے۔ حالانکہ تسلی کے محتاج یہی ہیں
ہم جانتے ہیں کہ ان میں سے بہت لوگ نہ اپنے کسی قصور سے بلکہ
غالباً دوسروں کے گناہوں اور بدیوں کے باعث دکھ اٹھا رہے ہیں
اس لئے یہ تسلی کے زیادہ مستحق بھی ہیں۔ پھر ان عالموں کی تعلیم سے
جو موجودہ آرام یا تلافی یا آئندہ صلہ کا انکار تو نہیں کرتے لیکن اُسے بالکل

ایک غیر یقینی امر سمجھکر نظرانداز کرتے ہیں ان کو کیا حاصل ہوگا۔ یہ تو ہم نے مانا کہ اپنے محبوب کے لئے کام کرنے میں خواہ ہمارا کچھ ہی خرچ ہو بہت خوشی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن جب ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ ہماری یہ خود انکاری و خود قربانی بے فائدہ تھی تو اس سے سخت تکلیف پیدا ہوگی۔ ایسی بے ثمر برداشت وتحمل پر رُوح کو مستقل وقائم رکھنا نہایت مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے فلسفہ سے یاس اور ناامیدی پیدا ہوجاتی ہے جیسے بُدھ کی تعلیم سے ہوئی۔ زندگی کی مایوسی ایک ایسا امر واقعی ہے کہ اُسے دیر تک نظرانداز نہیں کرسکتے۔ پس جو فلسفہ اس امر کو نظرانداز کرتا ہے وہ مایوسی کا دین قائم کرتا ہے ٭

اس جہان میں بہت مرد وعورت ایسے گزرے ہیں جنہوں نے غم کے اس سخت بوجھ کا مقابلہ کیا اور غالب ہوئے اور یہ ممکن ہے کہ آخرکار ایک بہت بڑے حصّہ انسان کو بہت بڑی خوشی مل سکے۔ البتہ یہ لاینحل امر بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ نوع انسان کا بہت بڑا گروہ اُس تمنا کو حاصل کرنے میں قاصر رہا جس کے پیچھے وہ مرا جاتا تھا اور یہ بھی سچ ہے کہ بہت لوگوں نے ایک خوشحال مستقبل زمانے کا تصوّر باندھنے سے تسلی پائی اور اپنے اس تصوّر کو دین کی صورت میں ظاہر کیا۔ مگر یہ خاصہ صرف مسیحی دین ہی کا ہے کہ اس نے ان تمناؤں اور مصیبتوں کا علاج پیش کیا ہے۔ یہ عجب بات ہے کہ جو فلسفہ مسیحی دین کی جڑ اُکھاڑ کر اپنے تئیں اُس کی جگہ قائم کرنا چاہتا تھا اب وہ خود مسیحی دین کی تائید میں ظن پیدا کرتا ہے۔ جو آیت میں نے عنوان میں لکھی ہے وہ پہاڑی وعظ کے شروع کی آیت ہے اور ہمارے خداوند کی تعلیم کی یہ کُنجی ہے

وہ آسمان کی بادشاہت کا اشتہار دیتا آیا۔ ایک روحانی سلطنت کا جو مرئی سلطنت سے تو متفرق ہے لیکن واقعی ویسی ہی ہے۔ وہ اسی جہان میں ہے اور ہم اُس میں خوشی حاصل کرسکتے ہیں۔ مسیح نے یہ اشتہار دیا کہ اس سلطنت میں وہ ساری حاجتیں پوری ہوسکتی ہیں جن کے پورا کرنے میں جہان قاصر رہا ہے۔ جو مصیبتیں اس جہان میں پیش آتی ہیں اُن کا علاج اس روحانی آسمانی سلطنت میں ہے۔ دل کے غریب۔ حلیم اور مظلوم یعنی ایسے لوگ جو فی زمانہ حقیر گنے جاتے ہیں اس سلطنت میں پناہ پاتے اور کارآمد ہوتے ہیں۔ اس جادو اثر اشتہار نے غم اور افسوس کی زندگی کو صاف مٹا میٹ کیا۔ اگر ایسی سلطنت کی تائید معجزوں کے ذریعے ہو اور ایک کامل دُکھ اُٹھانے والے کی مثال سے اس کی تشریح ہو اور ایک ذوالجلال قیامت سے اس کا اظہار ہو تو کیا تعجب۔ اس کے ذریعے جہان کے کمزوروں نے زورآوروں کو حیران کردیا۔ اس نے مصیبت زدوں کو خوشحالوں کی نسبت زیادہ استقلال بخشا اور جو غم کا نشان تھا یعنی صلیب وہ جہان میں اعلےٰ فتحمندی کا نشان ٹھیرا ٭

علاوہ ازیں یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ ہمارے خداوند نے یہ منکشف نہیں کیا کہ ان موجودہ غموں کا آئندہ اجر ملے گا بلکہ ایک روحانی سلطنت کو منکشف کیا جس میں رُوح کی اعلےٰ قوتیں متواتر نشوونما پاسکتی ہیں۔ اگرچہ انسان چاروں طرف دُکھوں اور مصیبتوں سے گھرا ہو دل کی غریبی اور حلم وصبر اُس خالی توکّل کا نام نہیں جو مشرق کا خاصہ ہے۔ بلکہ وہ رُوح کی ایسی پُرامّید برداشت ہے جو روحانی حقیقتوں سے علاقہ رکھتی ہے اور ایمان و نور باطن کی قوتوں کو کمال کی طرف لے جاتی ہے۔ رسول کہتا

ہے کہ "صرف یہی نہیں بلکہ ہم مصیبتوں میں بھی خوش ہوتے ہیں یہ جان کر کہ مصیبت صبر پیدا کرتی ہے اور صبر تجربہ۔ اور تجربہ امید اور امید کبھی شرمندہ نہیں کرتی کیونکہ خدا کی محبت رُوح القدس کے وسیلے جو ہمیں دیا گیا ہمارے دلوں میں جاری ہوئی" (رومیوں ۵: ۳) پس شہیدوں کی زندگی کا بڑا کام صرف یہی نہ تھا کہ جس عقیدہ کو وہ مانتے تھے اُس کی شہادت دیں بلکہ اس سے کہیں بڑھکر کیونکہ اُنہوں نے جہان پر نئی روحانی حقیقتوں کو۔ آسمانی مزاج کو اور الٰہی صفتوں کو منکشف کیا اور اس طرح سے وہ رفتہ رفتہ دنیاوی مزاج کو خدا کی سلطنت کے احاطۂ تاثیر میں لے آئے۔

جب سے یہ وعظ پہاڑ پر سنایا گیا تب سے ہر مصیبت زدہ کے لئے ایک طرح سے روحانی جہان کا دروازہ کھل گیا ہے۔ مسیح نے ایسی سلطنت منکشف کی ہے جس میں ہر کوئی کام کر سکتا ہے اور کسی کی محنت ضائع نہیں ہوتی اور رُوح کی ہر اہم ضرورت اس میں پوری طرح سے رفع ہو سکتی ہے۔ مسیح اناجیل میں کسی سے یہ نہیں کہتا کہ اپنی اعلیٰ خوشحالی کو دوسروں کی بھلائی کے لئے فدا کر دو بلکہ برعکس اس کے وہ یہ یقین دلاتا ہے کہ دوسروں کی خوشحالی ڈھونڈھنے ہی میں (خواہ ظاہر میں اُس پر کتنا ہی خرچ کیوں نہ ہو) وہ اپنی اعلےٰ اور مطلق خوشحالی پائینگے۔ (دیکھو لوقا ۱۹: ۲۹) "ایسا کوئی نہیں جو گھر یا بیوی یا بھائیوں یا ماں باپ یا اولاد کو خدا کی بادشاہت کے واسطے چھوڑ دے اور اس زمانہ میں اُن سے کئی گنا زیادہ اور آنے والے عالم میں ہمیشہ کی زندگی نہ پائے" خواہ کوئی کتنے ہی بوجھ تلے نہ دبا ہو یسوع مسیح ہر ایک سے اطمینان و آرام کا وعدہ کرتا ہے +

الغرض اگرچہ ہم اسی جہان کا لحاظ کریں تو بھی یہ ماننا پڑیگا کہ انسان

کی تمنا خوشحالی کے واسطے ہے۔ اور آپ لوگ یہ مانتے ہیں کہ اکثر صورتوں میں یہ حاصل نہیں ہو سکتی۔ لیکن ذرا اُس روحانی جہان کا خیال کرو جو مسیح نے ہمارے سامنے کھول دیا ہے تو آپ مان جائینگے کہ ہاں اس زندگی میں کوئی شخص اپنی رُوح کی تمنا حاصل کرنے سے محروم رہنے پر مجبور نہیں۔ سخت سے سخت کام روحانی ہمدردی کے وسیلے ملائم ہو جاتا ہے اور تاریک سے تاریک راہ آسمانی نور سے روشن ہو سکتی ہے اپنے دل سے اور تجربہ سے دریافت کریں کہ کیا یہ سچ نہیں۔ کیا آپ نے ایسے شخص نہیں دیکھے کہ اُن کے چہرے پر سالہا سال کے غم اور دُکھ کے آثار پائے جاتے ہوں لیکن پھر بھی روحانی زندگی کی شعاعیں چہرے پر چمک رہی ہیں۔ ایسی سیرت کے اشخاص محض برداشت کرنے والے نہیں بلکہ وہ زندہ کارکن اور اُن کی روحانی قوتیں ترقی کر رہی ہیں۔ اس کامل زندگی کو ارسطو نے خوشحالی کے تصور کو کامل کرنے کے لئے ضروری سمجھا۔ روحانی قوت اس وقت کام کر رہی ہے اور کمال تک بڑھتی جائے گی +

پس یہ ماننا پڑیگا کہ جب مسیح نے محض اعلےٰ اخلاق کی منادی کرنے کی بجائے اپنا کام شروع کرتے وقت اس نئے جہان کو اُن پر منکشف کیا تو اُس نے انسان کے عمیق خیالات اور حالات کو مدنظر رکھ کر کلام کیا۔ اس مکاشفہ پر پہاڑی وعظ کی کل تعلیم مبنی ہے۔ مسیح صرف اسی پر قناعت نہیں کرتا کہ آدمی اتنا سمجھ لیں کہ پاکیزہ زندگی کے لئے پاکیزہ دل ضرور ہے۔ بلکہ وہ انہیں آگاہ کرتا ہے کہ تم ایک روحانی سلطنت کے مؤثر قوانین تلے آ گئے ہو۔ وہ روحانی فتوؤں کا ذکر کرتا ہے جو شرعی یا اخلاقی فتوؤں سے

زیادہ خطرناک ہیں۔ وہ اُنہیں نصیحت کرتا ہے کہ اپنے لئے آسمان میں خزانہ جمع کرو۔ وہ حکم دیتا ہے کہ خیرات پوشیدہ دو۔ اور پوشیدہ دُعا مانگو تاکہ تمہارا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے تم کو ظاہرا بدلہ دے۔ ہاں یہ تو شاید سچ ہے کہ اس پہاڑی وعظ کی بعض ہدایتیں اگر محض اسی جہان کا لحاظ کیا جائے تو فائدہ عام اور اس اخلاق کے مطابق نہ ہونگی جو محض اسی جہان کے لئے بنایا گیا ہو۔ نہ مسیح نے ایسا کیا ہے۔ بلکہ اُس نے تو ایک نئی سلطنت مع نئے قوانین کے منکشف کی اور وہ ہمیں بتلاتا ہے کہ اپنی رفتار ان کے مطابق سدھاریں ◆

اب یہ نتیجہ نکلا کہ جو زندگی آدمیوں کی اخلاقی فطرت کے سامنے اس جہان میں پیش کی جاتی ہے اُس سے اعلےٰ زندگی کا مکاشفہ مسیح نے ہمیں بخشا اور یہ مکاشفہ انسانی رُوح کے تقاضے کو پورا کرتا اور اُس کی حالت کے عین مطابق ہے۔ یہ زندگی حال اور استقبال دونوں زمانوں پر شامل ہے۔ تو کیا ایسا پیغام جس نے اس مکاشفہ کا اشتہار دیا اپنی تائید میں زیادہ ظن کا مستحق نہیں۔ یا دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اخلاق کے نہائیت ابتدائی اُصولوں سے یہ ایا نکلتا ہے کہ ہمارے افعال کا معیار کسی ایسی شے کے ذریعے مقرر ہو سکتا ہے جو اس جہان کے واقعات و اشخاص سے پرے ہو۔ یعنی ہمیں فوق الفطرت امور کا لحاظ کرنا چاہئے۔ اُن کو صرف مسیح نے منکشف کیا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ اس کے ذریعے ظن سے بڑھکر کوئی دلیل پیدا ہوتی ہے۔ لیکن شروع میں اگر ظن بھی تائید کرے تو مسیحی دین کے مابعد دعاوی پر زیادہ غور کیا جائے گا ◆

لکچر سوم

راستبازی ایک شخصی رشتہ ہے

"اُنہوں نے پسند نہ کیا (نہ چاہا) کہ خدا کی پہچان کو حفظ کر رکھیں" (رومیوں ۱: ۲۸)

پچھلے لکچر میں یہ ایما پایا گیا کہ اس جہان سے (جو ہمارے مرئی رشتوں کا جہان ہے) پرے ایک اور جہان ہے جس میں خوشحالی کے بارہ میں ہماری وہ تمنا پوری ہو سکتی ہے جو رُوح کی ایک جبلی صفت ہے یہ خواہش جائز ہے اور حق کا معیار قائم کرنے میں اس تمنائے غائت کا لحاظ رکھنا ضرور ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہماری روحوں کا تعلق غیر مرئی اور روحانی سلطنت سے ہے یعنی ایسی آسمانی سلطنت سے جس کا اشتہار مسیح نے دیا ◆

جن معلمانِ اخلاق نے مسیحی بنیاد سے کنارہ کشی کی ہے وہ چند قسم کی سیرتوں کو بُرا جانتے ہیں لیکن اناجیل میں اُنہیں سیرتوں کی خاص طور پر تعریف آئی ہے۔ بہر حال اُن کی تائید میں یہ شہادت تو ملتی رہی ہے کہ ہمدردی و تنظیم حاصل کرنے میں وہ کبھی قاصر نہیں رہیں۔ مسیحی مقدسوں کی زندگی میں جو حلم اور دُکھوں میں صبر۔ غم و اُمید کی برداشت نظر آتی ہے اُن کے ذریعے بہت مایوس طبع لوگ حقیقی اطاعت کی طرف مائل

ہوئے۔ کیا ایسی صفات کے لئے ہم خدا کا شکر نہ کریں۔ میں یہ تو نہیں
کہتا کہ ایسی کوئی صفت مسیحی دین کے دائرے کے باہر کہیں پائی نہیں
جاتی۔ مگر ان لکچروں کا مقصد اس امر کا ظاہر کرنا ہے کہ انسان کی اخلاقی ذات
کے تقاضوں کی تشفی مسیحی دین سے ہوتی ہے۔ تواریخ بھی اس امر پر شاہد
ہے کہ اُمید و ہمدردی کا جو نیا عنصر پہاڑی وعظ نے نوع انسان کے سامنے
پیش کیا اس کے ذریعے یہ صفات متعلّا از حد قوت و توسیع پا گئیں۔ پہلے
ان کی حالت ایسی تھی جیسے کوئی پودا تاریک و سایہ دار مکان میں کافی نشوونما
نہیں پا سکتا۔ لیکن جب اُس کو وہاں سے اُکھاڑ کر کھلی مناسب جگہ میں
لگاتے ہیں تو اچھی طرح پھلتا پھولتا ہے۔ ویسے ہی جب سے مسیح نے
آسمانی سلطنت کی روشنی اُن پر ڈالی وہ نئے سرے سے ہرے بھرے ہو کر
لہلہانے لگ گئے*

جان سٹوارٹ مل صاحب کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ سوال ہمارے عمل کی
عین جڑ کے قریب معلوم ہوتا ہے تو بھی جتنا شک و بحث اس کے بارے
میں ہوا ہے اور سوال کے بارے میں نہیں ہوا یعنی حق و ناحق کا امتیاز
کرنا ہماری زندگی میں روزمرہ کی بات ہے تو بھی فیلسوف اب تک جھگڑ
رہے ہیں کہ اس کا ٹھیک معیار کیا ہونا چاہئے سقراط کے مکالموں میں جن
کے ذریعے پہلے پہل مغرب میں اخلاقی تحقیقات کا شوق مشتعل ہوا اُن میں
اس سوال کا خاص ذکر آتا ہے لیکن جب وہ اس مضمون کی تقسیم کرنے لگتا
ہے تو پھر جواب مشتبہ ہو جاتا ہے۔ تصورات کے بارہ میں افلاطون نے جو
رائے قائم کی ہے وہ اس کو حل کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اور اگرچہ دنیا
اسی کے باعث اس کی تعریف کرتی ہے مگر حیران بھی ہے کہ آخر فیصلہ کیا

ہوا۔ اب میں یہ پوچھتا ہوں کہ اس مقدمہ میں کوئی ایسا امر واقعی بھی ہے
جو ان مذکورۂ بالا بحثوں سے آزاد ہو۔ جن معمولی امور کے ساتھ راستبازی
کا خاص تعلق ہے اگر ہم اُن کی تحقیقات کریں تو اکثر یہ معلوم ہوگا کہ وہ
اشخاص کے باہمی رشتوں پر مبنی ہیں۔ کسی بیرونی اندازہ یا قیاسی معیار
سے اُن کو ہم پورے طور سے نہ افلاطون کے وقت میں جانچ سکتے تھے
اور نہ اب جانچ سکتے ہیں۔ وہ قاعدہ کلیہ یا عام اصول جس کے ذریعے کسی
فعل کا حق یا ناحق ہونا پرکھا جاتا ہے فاعل و مفعول کے رشتہ پر مشتمل و مبنی
ہے۔ جو غیر منحصر یا آزاد نیکیاں کہلاتی ہیں مثلاً پاکیزگی اور مردانگی اور خاص کر
صداقت کا فرض یا صدق جو ہر حالت میں رُوح کے لئے ضرور ہے
بادی النظر میں اس قاعدہ کلیہ سے مستثنٰی معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن انجام
کار یہ معلوم ہو جائے گا کہ یہ مثالیں بھی اُسی قانون کے ماتحت ہیں*
واضح رہے کہ نہ محض افعال کی صحت اُس رشتہ پر موقوف ہے
جو فاعل و مفعول کے درمیان ہوتا ہے بلکہ ہر فرد کی راستبازی اُس رشتہ
پر موقوف ہے جو ایک شخص کا دوسرے سے ہے۔ اور راستبازی کا
اندازہ بھی اُسی رشتہ سے لگ سکتا ہے نہ محض اعمال سے جو سرزد ہوتے
ہیں۔ اس بات میں انسانی رُوح انسانی بدن سے متفرق ہے۔ ان
دونوں کے خواص کے درمیان امتیاز نہ کرنے سے اکثر غلطی ہوئی ہے انسان
کی بدنی خوبیاں اور نقص ہم ہر فرد کا الگ الگ لحاظ کرنے سے ٹھیرا
سکتے ہیں۔ البتہ بعض صورتوں میں نر و مادہ کا لحاظ کرنا ضرور ہوتا ہے
کیونکہ نر و مادہ بہت کچھ ایک دوسرے پر موقوف ہیں۔ اس میں اخلاقی
قوانین کا عکس نظر آتا ہے۔ اس مستثنٰی امر کے سوا ہم عموماً یہ کہہ سکتے ہیں

کہ فلاں بدن حالتِ صحت میں ہے یا نہیں ۔ اور اگر وہ بدن بیمار ہو تو
دوسرے بدنوں کا لحاظ کئے بغیر اُس کا علاج ہو سکتا ہے ۔ اس لحاظ
سے بدن پودے کی مانند ہے یا مجرّد شے کی مانند ہے جس کی بڑی بڑی
صفات بلا تعلق کسی دوسرے پودے یا شے کے ہم بیان کر سکتے ہیں ۔
اس مشہور ضرب المثل میں کہ انسان تمدنی ہے اسی امتیاز کی طرف اشارہ
پایا جاتا ہے ۔ یہی تمدنی صفت انسان کو اعلےٰ سے اعلےٰ حیوان سے ممیز کرتی
ہے ۔ چونکہ یہ واقعی بات ہے کہ انسان تنہائی کی زندگی بسر نہیں کر سکتا
اس لئے اس کی اخلاقی حالت ہر لحظہ اُن رشتوں پر موقوف ہے جو وہ
اپنے چاروں طرف کے اشخاص سے رکھتا ہے ۔ اگر کوئی معلمِ اخلاق ہم
میں سے کسی کی حالت کا پورا بیان کرنا چاہے تو وہ اُس وقت تک
کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک وہ پہلے ہمارے دلوں کے اندر نظر
نہ مارے اور پھر ہمارے مختلف خاندانی و تمدنی گزشتہ و حال کے تعلقات سے
واقف نہ ہو ۔ ہم محض افراد نہیں ہیں جن کا یہ یا وہ بدن ہے ۔ ہم والدین یا
اولاد ۔ میاں بیوی ۔ خاوند نوکر ۔ دوست اور شہری ہیں ۔ پس یہ سوال کہ آیا ہم
حق پر ہیں یا ناحق پر دراصل یہ سوال ہے کہ ہم کس طرح اُن اشخاص کے
بارے میں جن سے ہم کو واسطہ پڑتا ہے برتاؤ رکھتے ہیں ۔ اولاد کی یہ خوبی
ہے کہ وہ اپنے والدین کے خاص رشتہ کو مدِنظر رکھ کر اس کے مطابق عمل
کرتی ہے ۔ شوہر اور والدین کی نیکی محض اس امر پر مشتمل نہیں کہ وہ حتی الامکان
اپنے خاندان کے عام فائدہ کے لئے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے اپنی
قوتوں کو استعمال کرے بلکہ اس امر پر کہ وہ اپنی بیوی یا اپنے بچوں سے کیسا
واسطہ رکھتا ہے ۔ اور جس نسبت سے بیوی اور اولاد اس رشتے کو محسوس

کرتے اور اس کے مطابق عمل کرتے ہیں اسی نسبت سے یہ رشتہ شوہر اور
والدین میں ترقی یا تنزل پاتا ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ حق و ناحق کی تعریف بالتفصیل کرنا دشوار ہے ۔ شریعت
قانون پر قانون ایزاد کرتی ہے لیکن ہمارے باہمی شخصی رشتوں سے جو بیشمار
تعلقات پیدا ہوتے ہیں اُن پر وہ محیط نہیں ہو سکتے ۔ عدل یا اقرار کرتا
ہے کہ میں ٹھیک طور سے اس کا فیصلہ نہیں کر سکتا ۔ اعلےٰ سے اعلےٰ انصاف
جو عدل کر سکتا ہے وہ بھی نسبتی انصاف ہے ۔

ٹھیک طور سے عزت و محبت کا لحاظ کرنا دیگر باریک محسوسات
کا اندازہ لگانا جو کسی سیرت یا صفت کو صورت بخشتے ہیں نہایت مشکل ہے ۔
ارسطو نے بھی اس وقت کو مانا ہے ۔ اگر کسی نے نیکی کی تعریف ایک قاعدہ
کلیہ کے طور پر کی ہے تو وہ ارسطو ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ نیکی ایک حدِ اوسط ہے
جو بذریعہ عقل مقرر ہو سکتی ہے ۔ ایسی حد جیسے صرف فیلسوف یا دانا شخص
ہی ٹھہرا سکتا ہے ۔ پس ہر معاملہ میں حق و ناحق کا فیصلہ کرنے کے لئے
ایک شخصی اندازہ لگانا ضرور رہا ۔ مخفی نہ رہے کہ یہ شخصی رشتے زندگی کا محض
ایک جز نہیں بلکہ بلحاظ اخلاقی مقصد کے کل زندگی انہیں شخصی رشتوں پر
مشتمل ہے ۔ جو کچھ ہم کرتے ہیں یا تو دوسروں کے کہنے سے یا دوسروں
کے فائدے کے لئے کرتے ہیں اور اُس فعل کے کرنے میں اُس فعل کی
خوبی کا اندازہ نہیں لگا سکتے جب تک اس امر کا لحاظ نہ کریں کہ ہم نے کس
نیت اور طبیعت سے وہ کام کیا ہے ۔

اگر مذکورہ بالا بیانات درست ہوں تو یہ نتیجہ نکلے گا کہ ہماری روحوں کی
راستبازانہ حالت کا حصر اُن شخصی رشتوں پر ہے جو ہم دوسروں سے رکھتے

ہیں اور دوسرے ہم سے رکھتے ہیں۔ ان دونوں باتوں کو یاد رکھنا چاہیے
جن سے ہمارا تعلق ہے۔ اگر وہ درست طور سے ہماری طرف راغب نہ ہوں
تب تک ہماری ذات کا نشوونما پورے طور سے نہیں ہو سکتا۔ البتہ آدمی خواہ
دوسروں سے درست سلوک کر سکتا ہے خواہ دوسرے اس کی طرف راغب
ہوں یا نہ ہوں لیکن اگر کوئی چاہے کہ انسانی ذات کا پورا کمال ظاہر ہو تو یہ ضرور
ہوگا کہ اُس کے والدین اُس کی بیوی اُس کے بچے اُس کے دوست اُس
سے کما حقہ سلوک کریں۔ اس وسیلہ سے اس کی ذات کے اصلی قویٰ
پورے طور سے تحریک پائینگے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ جس راستبازی کے
قابل انسان ہے وہ پورے طور سے نشوونما پائے تو چاہیے کہ ایک دانا
اور فیلسوف برابر اُس کے ساتھ رہے۔ اس بیان سے ظاہر ہوا کہ
راستبازی محبت سے ممیز ہے کیونکہ راستبازی اُس اعلےٰ محبت کا ایک
جزوی پہلو ہے۔ ہم تقریباً یہ کہہ سکتے ہیں کہ راستبازی استعارہ ہے اور
محبت حقیقت ہے کیونکہ زندگی کی حقیقت مشتمل ہے اُس رشتہ پر جو
اشخاص کا اشخاص سے ہے نہ اُس رشتہ پر جو اشخاص کا کسی قانون سے
ہے۔ پس اگر راستبازی کی حقیقت شخصی رشتوں پر موقوف ہے۔ تو گمان
غالب یہ نہیں کہ ہماری ذات کا یہ خاصہ عین اُس موقعہ پر جاتا رہے جہاں
ہمارے اعلےٰ نشوونما اور فوائد کا آغاز ہوتا ہے۔ کیا دلیل تشبیہ سے ہم
یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور نہیں کہ وہ خاصہ جو آخری دم تک ہمارے ساتھ رہتا
ہے وہ اس سے پرے بھی ہمارے ساتھ رہے گا؟ مخفی نہ رہے کہ اعلےٰ
سیرتوں میں یہ رشتہ زیادہ پختگی سے تکمیل پاتا ہے۔ لوگوں نے اکثر کوشش
کی ہے کہ اپنے تئیں ایسے رشتوں سے علیحدہ کریں اور یہ کوشش صرف مسیحی

زمانہ اور ممالک ہی میں محدود نہیں بلکہ غیر قوم فلسفہ اور بت پرست سوسائٹی
میں یہ کوشش زیادہ نظر آتی رہی۔ یہ تصور کہ اعلےٰ نیکی کفائت النفس پر مشتمل
ہے مسیحی عالموں کی تعلیم نہیں ہے۔ انسانی سیرت کا اعلےٰ نمونہ ستوئقی فرقہ
یا راہب لوگوں میں پایا نہیں جاتا بلکہ اُن لوگوں کے درمیان جنہوں نے اُس
اعلےٰ نمونہ کی پیروی کی جس کی ساری عمر محبت کے فرائض ادا کرنے میں صرف
ہوئی۔ اب میں یہ تو نہیں کہتا کہ تم ذرا اس وقت اُس وقت کا خیال کرو جب
جسمانی رشتے منقطع ہو جاتے ہیں اور صرف اُن کی یادگاری رہ جاتی ہے۔
میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہماری موجودہ زندگی کے حالات ہی کا لحاظ کرنا
اس امر کے تسلیم کرنے کے لئے کافی ہے کہ رُوح انسانی کے بعض ایسے تقاضے
اور قویٰ ہیں جو انسانی رشتوں سے کہیں بالا ہیں۔ رُوح انسانی کے بعض تجربے
ہم کو انسانی تعلقات نظرانداز کرنے پر مجبور کرتے ہیں چنانچہ اکثر بڑے بڑے
بزرگوں نے ماں باپ بیوی اولاد کو ترک کیا بلکہ یہ تو روزمرہ کا تجربہ ہے کہ جب کبھی
کا عزیز مرجاتا ہے یا ہمیں کوئی اور سخت صدمہ پہنچتا ہے تو ہم جسمانی رشتوں سے نہیں بلکہ
کسی اندرونی رشتے سے تسلی پاتے ہیں۔ یہ اندرونی رشتہ کونسا ہے کیا ہم یہ خیال کر سکتے ہیں
کہ جب یہ جسمانی تعلقات اور رشتے میاں بیوی وغیرہ کے موقوف ہوگئے
تو ہم قانون۔ حکم۔ جبر کے غیر آباد طبقے میں دھکیلے جائینگے؟ ہرگز نہیں +
بہت لوگ ایسے ہیں جو مسیحی دین کو تو نہیں مانتے لیکن اتنا قبول
کرتے ہیں کہ ہماری عقل میں ایک ایسی اٹل تحریک ہے جس کے ذریعہ
سے ہم انسانی شخصی رشتہ کا تصور رفتہ رفتہ اعلےٰ رشتے سے اور فانی
کا غیر فانی سے منسوب کرتے ہیں۔ وہ اتنا کہینگے کہ ایسے نتیجہ کا ثبوت
نہیں اور اگر ہم زیادہ غور کرینگے تو ایسا دعوے چھوڑ دینگے۔ ایسے دعاوی

کا ذکر دوسرے حصہ میں ہوگا۔ لیکن اس وقت اتنا تو میں کہوں گا کہ جو
تشبیہ انسانی ذات کے کل تجربہ کے مطابق ہے اُس کی نسبت یہ ظن
غالب پیدا ہوتا ہے۔ اور اُس کا معقول طور سے انکار نہیں کر سکتے۔
مقدس نوشتوں سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ روحانی رشتے جسمانی رشتوں
سے مشابہ ہیں۔ چنانچہ بائیبل میں کل اخلاق کا لب لباب اس جملہ میں بند
کر دیا ہے کہ "تو اپنے پڑوسی کو اپنے جیسا پیار کر"۔ پس روحانی زندگی کے
قانون کے لئے ان سے بڑھ کر اور کون سے مناسب اور بہتر الفاظ ہو
سکتے ہیں کہ "تو خداوند اپنے خدا کو اپنے سارے دل سے پیار کر" پھر
بھی میں اس الٰہی ہستی کے اعلےٰ تصور کی تشریح اور تصدیق کسی دوسرے
موقع پر کروں گا۔ لیکن یہ نتیجہ کہ کوئی ایسی ہستی ہونی چاہئے جس کے ساتھ
رشتہ رکھنے پر ہماری روحوں کی اعلےٰ زندگی موقوف ہو ہمارے عام تجربہ
کے مطابق ہے۔ اس صورت میں راستبازی بھی ایک ہی قسم کی ہوگی خواہ
اس دُنیا کی سمجھیں خواہ اُس دنیا کی۔ جیسے اخلاقی راستبازی محبت پر مشتمل
ہے ویسے ہی روحانی راستبازی بھی۔ خواہ آسمان میں خواہ زمین میں ہماری
ذات کی صحت شخصی رشتہ پر مبنی ہوگی ؛

میں نے ذکر کیا تھا کہ پاکیزگی اور سچائی قاعدہ عام سے ظاہرا کچھ
مستثنےٰ معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن فی الحقیقت ایک طرح سے ایسی سب
نیکیاں بذاتہ تمدنی ہیں۔ اور اس امر سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ
توقیر نفسی (یا اپنی عزت آپ کرنا) کی ترقی بھی نہ عالم تجرد میں بلکہ حالت
تمدن میں ہوتی ہے۔ سوسائٹی میں رہ کر اپنے ہم جنسوں کے ساتھ
صحبت رکھنے کے ذریعے آدمی پورے طور سے سیکھتا ہے کہ میرا حق

مجھ پر کیا ہے۔ میرے خیال میں جو لوگ صداقت کی نہائت قدر
کرتے ہیں وہ اس امر کو تسلیم کرینگے کہ صداقت پر ہم محض اس لئے
عمل نہیں کرتے کہ وہ ہمارے ہم جنسوں کے لئے ایسی ضرور ہے۔
وہ محسوس کرتے ہیں کہ حق ہماری ذات میں ساری نیکی کی بنیاد ہے
انسانی فرائض کے خلاصہ میں حق کے لئے یہ تقاضا راستبازی کی
بنیاد بتایا گیا ہے اور یہ خلاصہ اُس ایمان پر مبنی ہے جو اب زیر بحث
ہے۔ شاید کوئی کہے کہ دس احکام قومی شریعت کا خلاصہ ہیں۔ لیکن
ہر زمانہ میں اُن کی نسبت یہ رائے رہی ہے کہ وہ شخصی اخلاق کا بھی
خلاصہ ہیں۔ چنانچہ اس حکم کے بعد کہ ایک ہی خدا کو ماننا چاہئے یہ حکم
آتا ہے کہ خدا کا نام بے فائدہ نہیں لینا چاہئے۔ چونکہ اُس زمانہ میں
سب وعدے قسموں کے ذریعے ہوتے تھے تو اُس حکم کا مقصد یہ
تھا کہ قول اور فعل دونوں میں درست ہونا چاہئے۔ جن کا یہ یقین وایمان
تھا کہ اُن کا براہ راست اور دائمی رشتہ ایک اعلےٰ روحانی وجود سے ہے
اُن کی زندگیوں کا مقصد اوسطے حق کی اطاعت ٹھیرا ویسا ہی کوئی اس کا
بھی انکار نہیں کرے گا کہ مسیحی دین کے ذریعے نہ صرف فعلی بلکہ باطنی پاکیزگی
کی ضرورت اور فرض زیادہ روشن ہو گیا ہے۔ کیونکہ یہ دین انسان کو یہ
تعلیم دیتا ہے (جیسا کہ مقدس پولوس ۱۔ قرنتی ۶: ۱۵ میں لکھتا ہے)
کہ وہ اپنے تئیں مسیح کے اعضا سمجھیں۔ اور اس طریقہ سے انسان ایسا
کامل مقدس شخص کی شراکت حاصل کر لیتا ہے۔ اور توقیر نفسی (اپنی
مدد آپ) کا خیال روحانی تحریک کے ذریعے زیادہ ترقی پکڑتا ہے ؛
شاید کوئی یہ کہے کہ یہ ظن جو ایک اعلےٰ ہستی کے بارہ میں پیدا ہوتے

ہیں ہم اُس کو کیونکر سچ مانیں جب تک کہ ہماری ذات میں کوئی خاص ایما
اس قسم کا پایا نہ جائے کہ ہم ایک ایسے وجود کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔
اور بالفرض ہم اگر یہ مان بھی لیں کہ ایسی رائے ہمارے تجربہ اور حاجات
کے عین مطابق ہے تو بھی ہم اس کو ایک رائے ایک قیاس ہی کہینگے
جب تک کہ ایسے شخص کا تجربہ ہمیں حاصل نہ ہو۔ مثلاً کبھی کوئی ستارہ
اپنی گردش کرنے میں کچھ اِدھر اُدھر ہو جاتا ہے اور اس کا یہ سبب بتا دیا
کرتے ہیں کہ کوئی اَور سیارہ ہے جس کی کشش کی تاثیر سے یہ ظاہرا
بے قاعدگی وقوع میں آئی ہے۔ لیکن ہم اس رائے پر یقین نہیں کر
سکتے کہ سچ مچ کوئی ایسا ستارہ موجود ہے جب تک کہ ہم اُس کی جگہ
اور گردش سے واقف نہ ہوں۔ آخر میں ہم اس بات کو ظاہر کرینگے کہ
ایسے سوال کا جواب ہمارے خداوندی زندگی اور تعلیم سے ملتا ہے
ایسے مکاشفہ سے پیشتر بھی ایسی شہادتیں ہیں خاص کر زبور کی کتاب
میں جن سے ایسے ایمان کی حقیقت و صداقت ظاہر ہوتی ہے جب
اس ظن کا مقابلہ اُس انسانی تجربہ کے ساتھ کریں (جس کا ذکر مزامیر میں
ہے) تو اس سے سنجیدہ مزاج لوگوں کے دلوں میں رغبت پیدا ہوگی
کہ ایسے شریف ایمان کا عملی تجربہ بھی حاصل کریں۔ لیکن اس موقع پر میں یہ
تسلیم کرونگا کہ اس اعتراض میں کچھ زور ہے اور اس کا کچھ جواب اس
مضمون کے دوسرے حصہ میں ملے گا یعنی آخری لکچر میں *
اب تک تو ہم اس بات پر غور کرتے رہے کہ حق و ناحق کا معیار
کیا ہے۔ لیکن اب ذرا غور کریں کہ حق و ناحق ہے کیا اور وہ فرض لازمی
کیا ہے جس کے باعث ہم محسوس کرتے ہیں کہ حق کی پیروی کرنی

چاہئے اور ناحق سے گریز کرنا چاہئے۔ جیسا میں نے ذکر کیا تھا۔ یہ ممکن ہے
کہ کسی خاص مقدمہ میں ہم غلطی سے سمجھ لیں کہ یہ حق ہے اور ہم اپنی اس
غلط رائے کے مطابق نہ صرف عمل کریں بلکہ عمل کرنا اپنا فرض سمجھیں۔ اب
ذرا خبرداری سے معلوم کرو کہ ہم تشریح کس امر کی کرنا چاہتے ہیں۔ کیا
اس امر کی کہ بعض تاثیرات اَوروں کی نسبت زیادہ مستقل اور ہماری ذات
کے زیادہ موافق ہیں نہیں کیونکہ وہ تاثیریں تو دوسری تاثیروں کی نسبت
بالکل مختلف طور سے اثر کرتی ہیں۔ اور یہ تو فرض اور خواہش کے درمیان
امتیاز ہے۔ حال ہی میں بہتوں نے کوشش کی ہے کہ حس اخلاقی
کی تعریف کریں۔ ان عالموں میں سے ایک نے تو یہ کہا کہ جب ہم تمدنی
مستقل تر عقل کو شخصی عارضی عقل سے مغلوب ہونے دیتے ہیں تو
جلد یا دیر بعد ایک طرح کی بے اطمینانی اور بے چینی ہماری طبیعت میں
پیدا ہو جاتی ہے۔ فرض کرو کہ ہم یہ رائے مان لیں تو یہ بے اطمینانی اور
بے چینی محض ناامیدی ثابت ہوگی۔ ورد آخرکار خوشی پر غالب آئیگا اور
ہم یہ معلوم کرینگے کہ ہمارے لئے کسی اَور طرح سے عمل کرنا زیادہ اچھا ہوتا۔
لیکن اس قسم کے خیال سے فعل بد کے لئے کوئی پچھتاوا پیدا نہیں ہوتا اور
نہ کسی نیک فعل کے لئے خوشی۔ ایسے اصول سے شاید اس بات کے
سمجھنے میں تو مدد ملے کہ بعض باتیں حق ہیں اور بعض ناحق۔ لیکن اس سے
اس امر کی کچھ تشریح نہیں ہوتی کہ جب ہم ایک چیز کو حق سمجھ لیتے ہیں
تو کیوں اُس پر چلنا نہ صرف گوارا بلکہ فرض لازمی سمجھا جاتا ہے۔ بعض ایسی
صورتیں بھی ہیں کہ جب آدمی سے ناحق سرزد ہوا ہے اگرچہ وہ یہ سمجھتا ہے
کہ اس کے اس فعل سے کسی کو باواسطہ یا بلاواسطہ کوئی نقصان نہیں

پہنچا تو وہ اپنے دل میں اپنے تئیں ملامت کرتا ہے۔ یہ اعتراض اُن لوگوں کی رائے پر عائد ہوتا ہے جو کہتے ہیں کہ ایسے خیال کے نشو و نما کی وجہ وہ تاثیر ہے جو جماعت کی فرد پر ہوتی ہے۔ لیکن فرض کے ادا ہونے پر جو سخت رنج اور پچھتاوا پیدا ہوتا ہے جبکہ ظاہرا کوئی تمدنی قانون بھی نہیں ٹوٹا اس کی تشریح ایسی رائے سے نہیں ہو سکتی ❖

اگر ہم کانشنس کے اختیار اور رُوح کے دیگر قوٰی کے درمیان امتیاز بھی کریں تو بھی یہ مشکل پورے طور سے رفع نہیں ہوتی کیونکہ جیسا ظاہر کیا گیا کانشنس نہ صرف زور بلکہ حکومت کرنے کا حق جتاتا ہے یہ محض ایک قوت نہیں بلکہ ایک بااختیار قوت ہے۔ اس رائے سے امر واقعی تو ظاہر ہے لیکن اس کی تشریح نہیں ہوتی ہم جو اپنے اندر فرض محسوس کرتے ہیں اس کی اصل کیا ہے۔ ہم چند سادہ مثالوں سے اس کی تشریح کرینگے اور اس تشبیہ کے ذریعے اعلےٰ رشتوں کا ذکر کرینگے۔ کیا فرض کا پہلا خیال اُس وقت پیدا نہیں ہوتا جب آدمی یہ جانتا ہے کہ میں نے فلاں شخص سے ایسا برتاؤ نہیں کیا جیسا مجھے چاہیے تھا۔ بچہ جب اپنے ماں باپ کو ناراض کرتا ہے تب اُس کو پہلی دفعہ ناحق کا خیال گزرتا ہے یہ ناحق کا خیال اس خیال سے متفرق ہے کہ میں نے کسی کو نقصان پہنچایا ہے کیونکہ نقصان کا شاید خیال بھی نہیں کیا تھا بلکہ یہ تمیز اور پہچان اس امر کی ہے کہ میں نے فلاں رشتے کو تسلیم اور ادا نہیں کیا۔ یہ امتیاز اس خوف سے بھی متفرق ہے کہ ہم کو سزا ملے گی۔ بے شک یہ خوف پیدا تو ہوتا ہے لیکن عجیب بات ہے کہ بعض اشخاص جن سے کچھ ناحق سرزد ہوا ہے وہ سزا

کو خوشی سے قبول کر لیتے ہیں۔ ان کے دل میں ایک طرح کا اطمینان پیدا ہوتا کہ اچھا ہوا سزا مل گئی ورنہ دل پر سخت بوجھ رہتا۔ ان کے لئے یہ کہنا بڑی تسلی کا باعث ہے کہ اس فعل کا نتیجہ اُٹھانے کو میں تیار ہوں اور اس سزا کے قبول کرنے کو وہ ایک طرح اپنا فخر سمجھتا ہے۔ حقیقی رنج اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ ناحق کا اندازہ ناحق کرنے والے کی سزا سے نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ خیال آتا ہے کہ ہم نے اپنی عارضی خوشی کے لئے ایسے شخص کو نقصان پہنچایا ہے جس سے خاص سلوک کرنا ہمارا فرض تھا گویا ہم نے امانت میں خیانت کی ہے اور احسان فراموش اور ناشکر گذار ہوئے ہیں بعضوں سے ہمارا خاص رشتہ تھا وہ ہم پر خاص حق رکھتے تھے اور خاص سلوک کے ہم سے متوقع تھے لیکن ہم نے اُن کو مایوس اور محروم کیا۔ اب ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم نے اُن سے اپنے تئیں جدا کیا ہے اب ہم شرم سے آنکھیں اُٹھا کر ان کی طرف دیکھ نہیں سکتے۔ یہ شریفانہ شرم محض خوف سے کہیں اعلےٰ ہے۔ یہ حقیقی رشتہ جتنا قریبی ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ یہ الزام کانشنس میں شدت سے محسوس ہوتا ہے ❖

لکچر چہارم

الٰہی شخصیت

"خداوند کہتا ہے کہ میرے خیال تمہارے خیال نہیں اور نہ تمہاری راہیں میری راہیں ہیں کیونکہ جس قدر آسمان زمین سے اونچے ہیں اُسی قدر میری راہیں تمہاری راہوں سے اور میرے خیال تمہارے خیالوں سے" (یسعیاہ ۵۵: ۸ و ۹) +

گزشتہ لکچر میں یہ ذکر میں نے کیا تھا کہ دلیلِ تشبیہ سے اس امر کا ظن غالب پیدا ہوتا ہے کہ جیسے ہمارے مرئی اور دنیاوی رشتے ہیں ویسے ہی ہمارے غیر مرئی اور ازلی رشتے ہیں۔ وہ رشتے محض اشیا سے نہیں بلکہ اشخاص سے ہیں۔ یہ بھی ذکر ہوا کہ اخلاق کی تعریفیں کامل اور ناقص صورتوں میں اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ راستبازی یا نیکی کی تعریف کسی قاعدہ کے ذریعے سے نہیں ہو سکتی اور اس کا ذکر بھی ہوا کہ روح کی صحت کا دارومدار اشخاص سے صحیح برتاؤ رکھنے پر ہے۔ اور جب ہم نے دیکھا کہ نادیدہ قوت کا فرض ہم پر ہے اور اُس فرض کا مقابلہ اُس فرض سے کیا جو ہم جنس ہم پر رکھتے ہیں تو اس سے بھی یہی نتیجہ نکلا تھا۔ یعنی یہ کہ روح شخصیتوں کے بڑے نظام کا ایک جز ہے۔ مجرد روح کو لینے سے اُس کی صحت کا فیصلہ

نہیں کر سکتے حالانکہ بے جان شے یا انسان کے بے جان حصہ کی صحت کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ ٹھیک جیسے کسی سیارہ کی حالت محض اُس کی اندرونی ساخت پر ہی مشتمل نہیں بلکہ اس امر پر بھی کہ دوسرے سیاروں کی کشش کی کیا تاثیر اُس پر اور اُس کی کیا تاثیر اُن پر ہو رہی ہے اور کہ یہ سورج کے گرد گردش کرتا ہے۔ ویسے ہی کسی شخص کی صحت یا نجات اس امر پر منحصر ہے کہ اُس کا تعلق دوسرے اشخاص سے کیا ہے، اور اس پر کہ وہ سب شاید مشخص جہان کے کسی مرکزی سورج پر حصر رکھتے ہیں۔ اگر صورت حال یہ ہو تو مقدس نوشتوں کا بیان نہایت سلیس اور پُر فلسفہ ہے۔ کیونکہ اخلاق کا عطر یہ نکالا گیا ہے کہ "تو اپنے پڑوسی کو اپنے جیسا پیار کر"۔ ویسا ہی اعلےٰ تعلقات کا نہایت ٹھیک بیان یہ ہوگا کہ "تو خداوند اپنے خدا کو پیار کر"۔

یہاں تک تو گمان تھا۔ اب ایک ایسی قوم اور ایک ایسی کتاب فی الحقیقت موجود ہے جس میں حال اور مستقبل زندگی کا کل بیان اسی کے مطابق ہوا ہے۔ رومیوں کے لئے خاص مؤثر خیال قانون کا تھا۔ یونانیوں کے لئے "خوبصورتی" کا۔ لیکن یہودیوں کے لئے ایک اندیکھے شخص کی مرضی و محبت۔ کتاب مقدس کے ہر صفحہ پر یہ سبق نقش ہے کہ ایک مشخص وجود ہے اور مصنفوں کا اس سے ایسا قریبی رشتہ تھا کہ اور کسی شخص یا شے سے نہیں ہو سکتا۔ نادیدہ جہان پر جو ایک نقاب پڑا ہوا ہے وہ یہاں اُٹھ جاتا ہے اور ایک عجیب روح کی رویت منکشف ہو جاتی ہے جس میں ہم جیتے اور چلتے پھرتے ہیں اور جس پر ہمارے بدن اور روح مطلقاً موقوف ہیں۔ اب سوال زیر بحث

یہ ہے کہ عبرانی اور مسیحی نبیوں کی روئیتوں نے جو کچھ ہم پر منکشف کیا ہے وہ ان تقاضوں کے مطابق ہے جن کا ذکر ہم نے کیا تھا اور ہماری اخلاقی ذات کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے یا نہیں +

اعتراض اوّل :- اس موقع پر یہ ضرور ہے کہ جو ابتدائی اعتراض اس بیان پر پیدا ہوتا ہے اُس کو رد کریں - ایک مشہور عالم[1] بڑی سنجیدگی اور سرگرمی سے یہ ذکر کرتا ہے کہ شخص خدا کا یہ تصور یہودی نوشتوں کے اصلی معنوں میں داخل نہیں - اس سے کچھ عرصہ پہلے ایسا بیان کم سے کم انگلستان میں بیہودہ سمجھا جاتا اور حقیقت میں یہ ایسا ہی ہے - لیکن چونکہ ان دنوں میں اس قسم کی رائے تقریباً ہر جگہ پائی جاتی ہے - دیندار لوگ بھی الٰہی شخصیت کا زیادہ واضح الفاظ میں بیان کرنے سے ڈرتے ہیں اور الٰہی ذات کی نسبت یہ رائے ترقی پر ہے کہ وہ ایسی اعلےٰ اور بیرون از قیاس ذات ہے کہ اُس سے اس قسم کا شخصی رشتہ منسوب کرنا ناممکن ہے اور دین کا لب لباب اُن کے نزدیک صرف یہ ہے کہ ایک دوسرے سے صحیح برتاؤ رکھیں - جب کوئی شخص ذکر کرتا ہے کہ میں خدا کی ذات کے بارے میں کافی علم رکھتا ہوں تو اُس پر از حد ہنسی کی جاتی ہے - ایسے لوگوں کا خیال ہے کہ عبرانی مصنفوں نے شاعرانہ طور پر شخص کا خیال خدا پر جمایا ہے - وہ اس جملہ کی کہ "خداوند ہمارا ایک خداوند ہے" یہ تفسیر کرتے ہیں کہ سنجیدگی پیدا کرنے کا یہ ایک طریقہ ہے - اور خدا پر توکل رکھنے کے یہ معنے بتائے جاتے ہیں کہ قانون روش پر بھروسہ رکھیں +

بائبل کی عبارت ایسی مشکل نہیں ہے کہ اس قسم کی تشریح کو کوئی

[1] میتھیو آرنلڈ صاحب +

مانے ذرا سوچو تو سہی کہ عبرانی نوشتے شروع کس طرح سے ہوتے ہیں - کیا شروع میں زندگی یا روش کے کسی قانون کا مکاشفہ ہے - ہرگز نہیں پہلے الفاظ یہ ہیں "ابتدا میں خدا نے آسمان و زمین کو پیدا کیا" بعد ازاں خدا کی آواز - مرضی اور تجویز کا ذکر آتا ہے - اس عبارت کے عملی معنے سمجھنے کے لئے اس امر کی چنداں ضرورت نہیں کہ دنیا کی ابتدا کا کیا ذکر ہے - پہلے باب کا جو اثر دل پر پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا ہے اور اُس نے سب کچھ بنایا - بائبل میں اکثر خدائی شخصیت کا تصور پیدا کرنے کے لئے فطرت کے واقعات کو پیش کیا ہے - مشہور مقام ایوب کی کتاب میں ہے (ایوب ۳۸ باب) - جب ایوب اور اُس کے دوست الٰہی انتقام کا بیان کرنے میں قاصر رہے تو خدا نے گرد باد میں سے ایوب کو جواب دیا "اب مرد کی مانند اپنی کمر باندھ - میں تجھ سے سوال کرونگا تو مجھ سے بیان کر تو کہاں تھا جب میں نے زمین کی بنیاد ڈالی بتا اگر تو نے سمجھ حاصل کی ہے" اس کل باب کو موسیٰ کی پہلی کتاب کے پہلے باب کا شاعرانہ بیان کہہ سکتے ہیں - یہودی ایمان کی بنیاد انسانی روش کے لحاظ سے نہیں پڑی بلکہ اُس اعلےٰ قدرت اور حکمت کے مکاشفوں پر جو فطرت پر غور کرنے سے دل پر ظاہر ہوتے ہیں - ابتدائی زمانہ میں شاید ہمارے زمانہ کی نسبت اس قسم کا اثر زیادہ پڑتا تھا - ایوب کی کتاب میں جس کا ذکر ہے کہ اپنی مرضی کے مطابق آسمان و زمین میں ہر مخلوق کو پیدا کرتا اور اُس پر حکمرانی کرتا ہے وہ محض قانون یا ایک تاثیر نہیں - ایک دوسری مثال لیجئے - مزمور ۱۰۴ کو دیکھو - اس مزمور کی شروع آیات ہی سے کیا اثر دل پر ہوتا ہے ؟ "اے میری جان خداوند کو مبارک کہہ - اے خداوند

میرے خدا تو نہایت بزرگ ہے۔ تو حشمت اور جلال کا لباس پہنے ہوئے ہے۔ وہ نور کو پوشاک کی مانند پہنتا ہے اور آسمانوں کو پردے کی مانند پھیلاتا ہے۔ وہ اپنے بالاخانوں کو پانیوں میں بناتا ہے اور بدلیوں کو اپنی رتھ ٹھیراتا ہے اور ہوا کے بازوؤں پر وہ سیر کرتا ہے وہ اپنے فرشتوں کو روحیں بناتا ہے اور اپنے خدمتگزاروں کو آگ کا شعلہ"۔ کیا یہ روز روشن کی طرح ظاہر نہیں کہ مزمور نویس کا مقصد یہ ہے کہ ان الفاظ کے ذریعے ایک شخصیت کو منکشف کرے؟ مصنف عام شاعروں کی طرح فطرت کا بیان کرنے کے لیے شخصی تصورات کو استعمال نہیں کرتا بلکہ فطرت کے واقعات کو ایک شخص کا بیان کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ یہ مزامیر ہی جن میں فطرت کا بیان ہے عبرانی نبیوں کے خاص تصور اور خیال کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہوں گے۔ لیکن جب ہم اُن مزامیر پر غور کرتے ہیں جن میں انسان کے دل کی اندرونی حالت کا بیان ہوا ہے تو یہ شخصیت ایسی نمودار ہو جاتی ہے کہ غلطی کا امکان نہیں رہتا۔ شاید کوئی ترجمے کو زیادہ لکر یوں کہے کہ جہاں لکھا ہے کہ "خداوند میں خوشی کرو" وہاں مراد ہے "ازل میں خوشی کرو" یعنی اُن کے خیال میں اس سے ایسی خوشی مراد ہے جو روش انسانی سے پیدا ہوتی ہے لیکن اس قسم کی تشریح بہت دور تک چل نہیں سکتی مثلاً ۱۰۳ مزمور کی تشریح وہ کیسے کریں گے جہاں لکھا ہے خداوند رحیم و کریم ہے۔ غصہ ہونے میں دھیما اور شفقت میں بڑھکر ہے اس کا جھنجھلانا دائمی نہیں۔ وہ اپنے غصے کو ابد تک نہیں چھوڑتا ...... جس طرح باپ اپنے بیٹوں پر ترس کھاتا ہے۔ اُسی طرح خداوند اُن پر جو اس سے ڈرتے ہیں کہ وہ ہماری حقیقت کو جانتا ہے وہ یاد رکھتا ہے کہ

ہم مٹی ہیں"۔ یہ خواہ کیسا ہی شاعرانہ بیان ہو لیکن اگر یہاں ایک شخص کا ذکر نہیں تو یہ بے معنی اور مصنف بے تکی باتیں کرتا ہے۔

دیگر اعتراضات جو خدا کی شخصیت کے بارہ میں کئے جاتے ہیں اُن کا مفصل جواب دینے کی چنداں ضرورت نہیں۔ البتہ یہ تو سچ ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ شخصیت کیا ہے۔ ہم اپنی شخصیت کی تہ تک بھی نہیں پہنچتے۔ لیکن اس لاعلمی سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ہم میں ایسی کوئی شے نہیں جسے شخصیت کہتے ہیں اور جس کے ذریعے ہم دیگر بے جان اور جاندار چیزوں سے امتیاز پاتے ہیں۔ سائنس میں یہ قانون ہے کہ کسی شے کی تعریف کرنے سے پہلے ہم اُس کی قسم دریافت کرتے ہیں۔ جب تک یہ نہ کریں ہم ایک قدم سائنس میں بڑھا نہیں سکتے۔ اگر ہم بیدرانہ ترس کو ایک رحیم نجات دہندہ کی شفقت کو۔ منصف کی معافی کو ایک قانون یا قوت سے منسوب کریں تو یہ بیوقوفی ہوگی۔ یہ بھی سچ ہے کہ مقدس نوشتوں کے مصنف اس قسم کے منطقی اور فلسفی امتیازوں میں اپنے تئیں نہیں اُلجھاتے۔ لیکن وہ ہماری نسبت زندگی کے اعلےٰ و مقدم امور کو زیادہ سمجھتے تھے اور خدا کو کم سے کم اُسی قسم کا شخص جانتے تھے جیسے ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ رُوح کی بعض تحریکیں ایسی ہیں جو اشخاص ہی میں تحریک پا سکتی ہیں اور یہودیوں نے سمجھا کہ یہ تحریکیں خدا کے بارے میں ہمارے اندر پورے طور سے مشتعل ہو سکتی ہیں۔ مثلاً محبت۔ بھروسہ وغیرہ۔ ان کو یقین تھا کہ اگر ہم اُس کو پیار کریں گے وہ ہم کو پیار کریگا۔ اگر ہم اُس پر بھروسہ رکھیں گے وہ ہماری مدد کریگا۔ ضروری سوال یہاں یہ نہیں کہ خدا کی ذات کیا ہے بلکہ یہ کہ خدا کی طرف ہماری کیسی رغبت ہونی چاہئے اور یہ کہ خدا ہماری طرف

کیسی رغبت رکھتا ہے۔ یہودی یہ آسان عام فہم جواب دیتے کہ وہ خدا سے ویسی ہی رغبت رکھ سکتے ہیں جیسی وہ دوسرے مخلوق سے رکھتے ہیں ہم کو وہ اشخاص سمجھتے ہیں اور خدا بھی اُن سے ویسی ہی رغبت رکھتا ہے۔ یہ تو سچ بات ہے گو علمی طور پر ہم لفظ شخص کی تعریف نہ کر سکیں؟

اعتراض دوم۔ ایک اور قسم کے معترض بھی ہیں وہ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ مقدس نوشتوں میں خدا متشخص منکشف ہوا ہے لیکن وہ یہ کہتے ہیں کہ جو سیرت خدا کی خاص کر پُرانے عہدنامہ میں بیان ہوئی ہے وہ خدا کے شایاں نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہودیوں نے خدا کو شخص تو سمجھا لیکن بہت کچھ اپنے جیسا شخص غصّہ ور۔ حاسد۔ تائب اور تُند عہد عتیق کے بزرگوں نے جو القاب خدا کے بیان کئے ہیں میں اُن سب کی حمایت تو نہیں کرتا کیونکہ اُن کا بیان تواریخی طور پر ہوا ہے یعنی جیسا کسی نے کہا ویسا لکھ دیا گیا۔ اور اس امر کا لحاظ نہیں کیا گیا کہ یہ تعلیم درست ہے یا غلط اس لئے یہ ممکن ہے کہ کبھی ان کے خیالات خدا کے بارے میں شایاں نہ ہوں جیسے کبھی کبھی ان کے کام بھی خدا کے بندوں کے شایاں نہ تھے۔ لیکن میں پھر بھی یہ کہونگا کہ یہ اعتراض غلط فہمی پر مبنی ہے۔ معترضوں نے اس بات کا لحاظ نہیں کیا کہ کس طبیعت اور مزاج کا وہاں اظہار ہے۔

ہم نے اس بات کا ذکر کیا تھا کہ خدا کی سیرت کا بیان کرنے کے لئے امور فطرت کو استعمال کیا ہے۔ ایوب کی کتاب کا مصنف اور مزمور نویس جو کچھ فطرت میں عالیشان با قدرت خوبصورت یا دانا مشاہدہ کرتے ہیں اُن کے ذریعے سے خدا کی اعلےٰ صفات کا کچھ نقشہ ہمارے دل پر جمانا چاہتے ہیں۔ مزمور نویس اِن اُمور کو لباس سے مشابہ ٹھیراتا ہے۔

لباس کے ذریعے لباس پوش کا مکاشفہ بھی ہوتا ہے۔ لیکن لباس لباس پوش کو ڈھانپے ہوئے بھی ہے۔ فطرت میں جو کچھ اعلےٰ ہے وہ الٰہی ذات کا گویا عکس ہے۔ ان سب کو جمع کر کے خدا کی کچھ تصویر نظر آ جاتی ہے۔ جیسے مزمور ۱۰۴ میں پس جب خدا کا مکاشفہ کسی قدر بے جان اُمور فطرت کے ذریعے ہو سکتا ہے اور وہ اعلےٰ اُمور ایک طرح کا عکس ہیں تو کیا انسانی ذات کے ذریعے اُس کا کچھ مکاشفہ نہیں ہو سکتا۔ گو ہم گرے ہوئے ہیں اور ناقص ہیں تو کیا خدا کی خلقت میں ہم ہی ایسے برے ہیں کہ خدا کی صفات کا کوئی سایہ اور عکس ہم میں پایا نہ جائے؟ انسانی دل اور جان گو دغاباز ہو تو بھی تو تیاں کی وحشی قوت سے وہ اعلےٰ ہیں۔ کیا انسانی عقل طبعی نور سے بھی ادنےٰ ہے کہ وہ خداوند کا لباس نہ ہو سکے؟ مقدس نوشتوں کے مصنف تو انسان کو ایسا حقیر نہیں جانتے کہ اُس میں خدا کا جلال اور اُس صنعت ظاہر نہ ہو سکے۔ جیسے ۱۰۴ مزمور میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ نور۔ فضا۔ بادل اور ہوا خدا کا جلال ظاہر کرتے ہیں ویسے ہی عموماً ساری بائبل میں انسانی جذبات قابلیتوں وغیرہ کو الٰہی ذات کے کمالات کا سایہ بتایا ہے۔ غصّہ۔ غیرت۔ توبہ۔ خفگی وغیرہ گو ادنےٰ قسم کے جذبات ہیں۔ لیکن جیسے فطرت میں طوفان۔ بھونچال وغیرہ آتے ہیں ویسے ہی انسانی دل کے یہ طوفان اور بھونچال ہیں۔ پس جب خدا کی نسبت یہ کہہ سکتے ہیں کہ "جلال کا خدا گرجتا ہے" "خداوند بہت پانیوں پر ہے" ویسے ہی انسانی رُوح کے گرجوں اور بجلیوں کے ذریعے اس کا بیان کر سکتے ہیں۔ ٹھیک طور پر یہ دونوں محاورے اور تشبیہیں درست ہیں لیکن راستی کو ظاہر کرنے کی یہ کوشش ادھوری ہے۔ اس قسم کے سارے

خیالات اور تشبیہات کو ملا کر خواہ وہ کیسی ناقص معلوم ہوں خدا کا تصور بائبل میں پیش کیا گیا ہے۔

اعتراض سوم - ان معترضوں میں سے ایک مشہور عالم[1] نے بائبل میں سے مختلف مقامات جمع کئے ہیں جن میں اس کے نزدیک خدا سے چند ہی صفات اور مزاج منسوب ہوتے ہیں۔ اور اس نے یہ عجیب نتیجہ نکالا ہے کہ یہودیوں کا خیال خدا کے بارے میں بہت پاک نہ تھا اور رفتہ رفتہ اس میں ترقی ہوئی۔ مثلاً ایک مقام میں لکھا ہے کہ خدا مقدس میں رہتا ہے۔ دوسرے مقام میں یہ لکھا ہے کہ "آسمان اور آسمانوں کے آسمان میں تیری گنجائش نہیں تو کتنی کم اس گھر میں ہوگی جو میں نے بنایا"۔ ایک مقام میں تو یہ ہے کہ وہ اپنے خادموں سے رفاقت رکھتا ہے۔ دوسرے مقام میں ہے کہ وہ پوشیدہ ہے اور اس کو کوئی دیکھ نہیں سکتا۔ ایک وقت تو اس کی نسبت یہ کہا گیا ہے کہ وہ اپنے لوگوں کے ساتھ بدی کرنے سے پچھتایا۔ دوسری جگہ لکھا ہے کہ وہ انسان نہیں کہ پچھتائے۔ ایک وقت تو وہ سوختنی قربانی طلب کرتا ہے۔ دوسری جگہ لکھا ہے کہ وہ قربانی نہیں چاہتا۔ اعتراض تو یہ تھا کہ یہودیوں نے خدا کو محض اپنے جیسا انسان ظاہر کیا ہے۔ اب مثالیں دیتے وقت اپنی ہی رائے کو کاٹ ڈالا کیونکہ ان ظاہراً نقیض خیالات کے ذریعے کم سے کم اتنا تو ظاہر ہے۔ کہ وہ محض ہمارے جیسا نہیں۔ کیونکہ اگر خدا کو ایسے الفاظ اور محاورات میں ظاہر کریں جو بالکل انسانی معیار اور تصور کے مطابق ہوں تب تو یہ اعتراض درست ہوگا لیکن ان نقیض تصورات کو پیش کرنے کے ذریعے ہی سے اس قسم کی رائے درست نہیں ٹھیرتی۔ البتہ معترضوں

[1] گریگ صاحب اپنی کتاب بنام "مسیحیوں کا عقیدہ" جلد اول۔

پر یہ اعتراض عائد ہوتا ہے کیونکہ وہ خدا کو اپنے جیسا خدا سمجھتے ہیں کیونکہ ان کی رائے کے مطابق خدا کا فطرت سے وہی رشتہ ہے جو ہمارا ہے یعنی وہ معمولی خواہش کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ جیسے ہم معمولی خواہش کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔ برعکس اس کے بائبل نے ہر شے کو جو بیرونی یا اندرونی فطرت میں اعلیٰ ہے۔ دنیا میں یا دل میں۔ اُن کو باہم ملا کر خدا کی ایک ذوالجلال تصویر کھینچدی ہے۔ اگر اس تصویر کو انسان پر عائد کریں تو نہیں ہو سکتی لیکن خدا پر یہ صفات ٹھیک طور پر عائد ہو سکتی ہیں اس سے ظاہر ہے کہ بائبل نے خدا کو محض انسان ظاہر نہیں کیا۔ البتہ انسانی تشبیہات کے ذریعے الٰہی ذات کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے چنانچہ سند کی آیت اس کا ثبوت ہے "میرے خیال تمہارے خیال نہیں۔ نہ تمہاری راہیں میری راہیں ہیں۔ کیونکہ جس قدر آسمان زمین سے اونچے ہیں ویسی میری راہیں تمہاری راہوں سے اور میرے خیالات تمہارے خیالات سے"۔

خدا کی شخصیت کے خلاف اعتراضات کا جواب دینا ضرور تھا کیونکہ جب تک کوئی یہ نہ سمجھے کہ خدا مشخص ہے وہ مسیحی دین کی اصولی باتوں کو بھی ٹھیک نہیں سمجھ سکیگا۔ مثلاً کفارہ کا مسئلہ مطلقاً سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک یہ نہ مانا جائے کہ خدا اور انسان کے درمیان شخصی رشتہ ہے۔ اور اس مسئلہ کے بارہ میں جو غلط بیانیاں پیدا ہوئیں وہ بھی اس وجہ سے کہ لوگوں نے بائبل کی عام صاف عبارت کو مجازی طور پر سمجھا۔ البتہ ان اعتراضوں سے یہ فائدہ تو نکلا کہ ہم نے دیکھ لیا کہ بائبل میں خدا کا تصور کیسا بیان ہوا ہے۔ اب ہم کوشش سے ان کو جمع کریں اور دیکھیں

کہ وہ رُوح کے اعلےٰ تقاضوں اور خواہشوں کے کہاں تک مطابق ہیں۔
ہم اپنا تجربہ پیش نہیں کرینگے لیکن قدیم بزرگوں کا۔ مثلاً زبور اور
صحف انبیا۔ یہ تعلیمی رسالے نہیں ان میں مصنفوں کی دلی حالت
منکشف ہوتی ہے۔ اور ان کا روحانی تجربہ ظاہر ہوتا ہے۔ ان
میں اوّل تو یہ بات پائی جاتی ہے کہ فطرت اور انسانیت میں جو
خوبی اور شوکت ہے وہ سب خدا میں پائی جاتی ہے اور خدا کے اس
تصور نے انسان میں ایمان پیدا کیا۔ ایسا ایمان جس نے اُن کو ہر طرح
کے خوف سے مخلصی دی اور انہوں نے یقین کیا کہ جیسے خدا سب سے
اعلےٰ ہے اس لئے جو اُس پر بھروسہ اور ایمان رکھتا ہے وہ اپنے سارے
طبعی اور روحانی دشمنوں پر غالب ہے۔ ان دو تصورات کو ملایا ہے وہ
اعلےٰ ہے لیکن وہ خاکساروں کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ اعلےٰ قدرت
رکھتا ہے۔ لیکن ہمدرد بھی ہے۔ اسی تصور نے دینداروں میں
ایک ہمت اور دلیری پیدا کر دی تھی۔ اس نعمت میں یہ دونوں تصور
ملائے گئے ہیں "اب خداوند جس نے اے یعقوب تجھ کو پیدا کیا اور جس
نے اے اسرائیل تجھ کو بنایا یوں کہتا ہے مت ڈر کہ میں نے تجھے
رہائی دی۔ میں نے تیرا نام لے کے تجھے بلایا۔ تو میرا ہے۔ جب تو پانیوں
میں گزر کریگا تو میں تیرے ساتھ ہونگا اور جب تو ندیوں میں ہو کے جائیگا
تو وہ تجھے نہ ڈبائینگی۔ جب تو آگ کے درمیان چلیگا تو تجھے آنچ نہ لگیگی
اور شعلہ تجھے نہ جلائیگا" (یسعیاہ ۴۳: ۱ و ۲)۔ دوسرے مذہبوں میں
بھی کم سے کم اُن میں سے ایک مذہب میں تو بعض بڑے بہادر گزرے
ہیں لیکن اُنہوں نے اکثر تقدیر کی تعلیم ایسے طور پر دی ہے کہ متواتر

ترقی اور روحانی جنگ کو وہ قائم نہیں رکھ سکتے۔ جب تک خدا کو ہم ایک
بڑا قادر مطلق خالق مانتے ہیں تو انسان کے آگے اور کوئی راہ ہی نہیں
کھلی سوائے اس کے کہ وہ اُس کے حکموں کو مانے اور اُس کی مرضی
کے آگے دُور ہی سے جھک جائے۔ لیکن اگر خدا میں وہ ساری اعلےٰ
صفات نہیں جو فطرت اور انسان میں پائی جاتی ہیں کہ وہ رحم کرتا اور
اپنے لوگوں کو مخلصی دیتا ہے اُن کی دستگیری اور مدد کرتا اُن کی حاجتوں
کو رفع کرتا جیسے باپ بچوں کی حاجتوں کو تب انسان بجائے مایوسی کے
اُمید ہمت کو حاصل کرتا ہے ۔

خوشی کی بات ہے کہ ان دنوں میں فطرت کی قوتوں اور عجائبات
کی تحقیقات بڑی دلیری اور سنجیدگی سے ہوتی ہے۔ حق کی تحقیقات
میں پورے طور سے نڈر ہونا غالباً ہمارے زمانہ کا خاصہ ہے اور آجکل
کے شک شکوک جن کا میں جواب دے رہا ہوں اس وجہ سے نہیں
کہ لوگ ماننا نہیں چاہتے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ وہ مشکلات کا مقابلہ
کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے یہ شک ایمان کا شک ہے نہ بے اعتباری
کا شک۔ اس لئے ہم اس سے گھبراتے نہیں۔ یہ آزاد خیالی تین سو
برس ہوئے کہ شروع ہوئی۔ اسی آزاد خیالی نے دین میں بڑا انقلاب
پیدا کر دیا جسے اصلاح کا زمانہ کہتے ہیں۔ لوتھر نے جس ایمان کو جگا دیا
وہ اب تک جرمنی میں موجود ہے۔ اور چونکہ اس نے خدا پر ایمان رکھنے
اور بھروسہ رکھنے کو سرسبز کر دیا اس لئے اب انسان ایسی باتوں کی
تحقیقات سے جھجکتے نہیں۔ اسی ایمان کا نتیجہ ہے کہ اب بہتوں میں
سعی بلیغ کے ساتھ کامل فرماں برداری اور اطاعت مل گئی ہے۔ اور اعلیٰ

دلیری کے ساتھ پرلے درجہ کی فروتنی کا رشتہ ہو گیا ہے۔ اور اس کے باعث اب انسان بلا تکبر کئے اپنے پر بھروسہ کر سکتا ہے ۔

لیکن جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ شخص خدا پر ایمان لانے کی تاثیر روح پر کیا ہوتی ہے۔ تب معلوم ہوتا ہے کہ ایسا ایمان ہماری ضرورتوں کے لئے کیسا مناسب ہے۔ شخصی رشتہ کا زور تب ہی ظاہر ہوتا ہے۔ قصہ کہانیوں کو لوگ اسی وجہ سے پسند کرتے ہیں کیونکہ ان میں ان شخصی رشتوں کا عمل اور صفتوں کا عمدہ طرح سے بیان ہوتا ہے۔ اور وہ بیان ہمارے دلوں کے تجربہ کے مطابق ہوتا ہے اس لئے دلوں پر ایسے بیان کی تاثیر ہوتی ہے۔ جس یونانی فیلسوف کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے اُس نے کیا خوب کہا ہے کہ مرثیوں نوحوں اور غم افزا قصوں کے ذریعے خوف اور ترس کے جو خیالات پیدا ہوتے ہیں اُن سے ہمارے دل صاف ہوتے جاتے ہیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ کوئی متنفس ترقی کرے تو اُس کے خیالات کو دوسرے متنفس کی طرف مشتغل کریں انسان کا دل ایک نازک پیچیدہ ساز ہے اُس کے بجانے کے لئے کوئی دوسرا دل بطور مضراب کے چاہئے۔ لیکن انسانوں میں سے کوئی ایسا نہیں خواہ وہ کتنا ہی نزدیکی اور سچا ہو جو دوسرے دل میں سے پورا راگ پیدا کر سکتا ہو۔ کیا کوئی ایسا شخص ہے جو کسی دوسرے انسان کے سامنے اپنے سارے گناہ کمزوریاں اور ضرورتیں ظاہر کر سکے۔ یا کوئی ایسا کامل شخص اور ہمدرد انسان ہے جو ہمارے دلوں میں کافی تسلی یا کافی تنبیہ پیدا کر سکے۔ الغرض ناقص انسان یہ پورا راگ پیدا نہیں کر سکتا۔ اس پورے راگ کے لئے ایک کامل۔ قادر رحیم شخص درکار ہے اور

وہ خدا ہے۔ فرض کرو کہ کسی کا عزیز محبوب جانی یار گزر گیا ہے کون انسان ہے جو پوری تسلی دے سکتا ہے۔ اور تسلی درکار ہے۔ کیا یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا نے اس قسم کی آرزوئیں اور قابلیتیں پیدا تو کی ہوں لیکن ان کا علاج کچھ نہ ہو۔ علاج یہ ہے کہ ایک شخص خدا ہے جس کو ہم سارے دل ساری جان ساری عقل اور ساری طاقت سے پیار کر سکتے ہیں۔ یہی مکاشفہ مزامیر میں پایا جاتا ہے۔ وہاں ایک ایسے وجود کا مکاشفہ ہے جس میں محبت۔ ہمدردی۔ راستی سے محبت۔ ناراستی سے عداوت۔ توبہ اور امید خوشی اور غم خوف اور دلیری الغرض وہ ساری آرزوئیں اور رغبتیں جو اس جہان کے پرے تک بھی جاتی ہیں پورے طور سے نشوونما پا سکتی ہیں۔ اُس کی ذات میں قدرت۔ غضب۔ عفو۔ ترس۔ محبت الغرض وہ ساری باتیں پائی جاتی ہیں جو ہماری اس قسم کی صفات پر تاثیر کر سکتی ہیں اور ان کو پاک بنا سکتی ہیں۔ یہ تو تجربہ کی بات ہے۔ اس تجربہ کی تائید اناجیل کے بیان سے ہوتی ہے کیونکہ اناجیل میں اُس وجود کا ایسا ہی بیان ہوا ہے کہ وہ ہم سے مستقل اتحاد اور ہمدردی رکھتا ہے جس کو ہم نے "دیکھا سُنا اور چھوا"۔ ایسا وجود ہمارے سامنے پیش کیا گیا ہے جو کامل ہے لیکن اُس تک ہماری رسائی ہے اور ہمارے دلوں کو پورا اطمینان دے سکتا ہے۔ اگر مزامیر کا بیان اور مقدس لوگوں کا تجربہ حقیقی مانا جائے تو اس تجربے کی اور بھی تصدیق ہو جاتی ہے۔ اس الٰہی شخص کے ساتھ رشتہ رکھنے کے ذریعے اُن کی محبت بھڑک اٹھی۔ اُن کی راستبازی ترقی کر گئی اُن کی ہمت بڑھ گئی ان کی عقل روشن ہو گئی۔ انہوں نے ایک الٰہی رفیق اور دوست کو پایا اس اعلیٰ اخلاقی تاثیر پر نہ محض منطقی قیاسی دلائل پر ہمارا ایمان مبنی ہے کہ ہم شخص خدا کو مانتے ہیں

لکچر پنجم

عقدۂ حل طلب

جو کچھ میں پہلے بیان کرچکا ہوں میں اُس کا سرسری ذکر کرونگا۔ کیونکہ اگلے پچھلے مضمون کو ملانے سے دلیل کا زور ظاہر ہوگا۔ اب سنئے میں نے اول تو یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ رُوح کے اصلی تقاضات یہ اشارہ کرتے ہیں کہ ہماری زندگی کا انجام یہی جہان نہیں بلکہ دوسرا جہان ہے اس لئے ہمارے اعمال کا معیار بھی وہی جہان ہوگا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اُس جہان کے رشتے غالباً شخصی رشتے ہونگے جیسا کہ اس جہان کے رشتے شخصی ہیں۔ جیسا اس مرئی جہان میں ہمارے فرائض کام اور ہماری خوشی محض اتفاقی نہیں اور نہ محض قاعدہ وقوانین پر مبنی ہیں۔ بلکہ ہمارے دلوں اور روحوں کی حالت پر کہ ان کا برتاؤ دوسرے شخصوں سے کیسا ہے ویسا ہی بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اگلے جہان میں ہوگا جہاں ہماری روحوں کے تقاضات کامل طور سے پورے ہونگے چنانچہ مسیحی شخص کو شخص خدا پر ایمان لانے سے بڑی تشفی ہوتی ہے کیونکہ وہ اُسے سارے دل وجان عقل وطاقت سے پیار کرسکتا ہے۔ گذشتہ لکچر کا یہ مقصد تھا کہ خدا کی شخصیت کے خلاف اعتراضات کو رفع کرکے

اس تصور کو واضح کرے۔ ہم نے بیان کیا تھا کہ مقدس نوشتے یہ سکھاتے ہیں کہ الٰہی ذات کا عکس خلقت کی ہر اعلیٰ اور اشرف شے میں نظر آتا ہے۔ جیسا کسی نے کہا ہے کہ "ہر پتے میں ہے پتا اُس کا" ہر شے گویا زبان حال سے خدا کی حضوری کا اقرار کرتی ہے۔ یا یہ کہو کہ ہر شئے اس کی عظمت کا گویا پردہ ہے پس انسان کی شخصیت اور قواے بھی اس کی فطرت کا بہتر مکاشفہ ہیں۔ یہ تو ہم نہیں جانتے کہ وہ الٰہی ذات کیا ہے۔ بائیبل بار بار ظاہر کرتی ہے کہ خدا ہماری عقلوں کی رسائی سے پرے ہے۔ لیکن اس قدر بیروں از قیاس نہیں کہ ہم کچھ بھی اُس کا خیال نہ کرسکیں "جس نے کان بنایا کیا وہ نہیں سُنتا؟ جس نے آنکھ بنائی کیا وہ نہیں دیکھتا؟"

یہ دلیل روحانی حالت پر زیادہ زور سے صادق آسکتی ہے "جس نے محبت کو پیدا کیا وہ محبت سے خالی ہوگا جس نے رُوح کی یہ صفت بنائی کہ ناحق سے نفرت رکھے کیا اس صفت کے مطابق اُس کی ذات میں کچھ نہ ہوگا"۔ ضروری مسیحی مسائل کا بیان کرنے میں خدا کے غضب۔ محبت۔ رحم۔ عدالت کا بار بار ذکر آئیگا لیکن یاد رہے کہ میں لفظ شخصیت کی تعریف نہیں کرتا کہ وہ کیا ہے۔ خواہ انسانی شخصیت ہو خواہ الٰہی۔ صرف اتنا کہتا ہوں کہ الٰہی ذات ہمارے ساتھ سلوک کرنے میں کچھ انسانی صورت اختیار کرتی ہے۔ شاید میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ ہماری محبت اور غضب الٰہی محبت اور غضب کا عکس ہیں ٭

ہم نے ایک تو یہ دریافت کرنے کی کوشش کی کہ اُس روحانی جہان میں کیا کچھ شامل ہے۔ آیا اُس میں مشخص وجود ہیں یا غیر مشخص۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر ضروری یہ سوال ہے کہ ہماری انسانی ذات میں یہ اجزا کس

حالت میں موجود ہیں۔ حق و ناحق کا تصور اور حق کے معیار کا تصور صرف
یہی ظاہر کرتے ہیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ یہ علم و مکاشفہ کہ خدا کے ساتھ
ہمارا کیا رشتہ ہے صرف یہ فائدہ بخشتے ہیں کہ انسان کیا کچھ کر سکتا ہے۔ لیکن
جو ذہن عملی طور سے انسانوں کو مفید ہو سکتا ہے وہ اس بات کو دریافت
کریگا کہ ہماری حالت کیا ہے۔ شاید اس خیال کا زور شروع میں معلوم نہ ہو۔
لیکن سچ پوچھو تو اخلاقی معلموں اور اکثر ذہنوں کی یہی بڑی کمزوری رہی ہے
کہ وہ اتنا ہی بتاتے ہیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے تھا لیکن موجودہ حالت
کا لحاظ وہ نہیں کرتے۔ کسی طبیب نے کہا ہے کہ طبابت کا لبِ لباب
یہ ہے کہ آدمی تندرست رہے اور یہ ضرب المثل ہے کہ پرہیز علاج سے
بہتر ہے۔ فرض کرو کہ کسی بیمار کو ہسپتال میں لے جائیں اور ڈاکٹر اس
کو یہ کہے کہ تمہیں پرہیز کرنا چاہیئے تھا تمہیں یہ یا وہ نہ کرنا چاہیئے تھا۔
کیا سب لوگ ایسے ڈاکٹر پر ہنسی نہ کرینگے کہ یہ کیا بکتا ہے۔ یہی حال ان
معلمانِ اخلاق کا ہے وہ ہمیں یہ تو کہتے ہیں کہ ایسا یا ویسا نہ ہونا چاہیئے
لیکن وہ یہ نہیں پوچھتے کہ ہماری حالت فی الواقع کیا ہے یہ اُن کا خاص
نقص ہے ٭

اصلی مقصد یہی ہے کہ اخلاقی طور پر انسان کی حالت اب کیا ہے۔
شخصی تجربہ کو لو یا عام لوگوں کے تجربہ کو یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ حالت
کمزوری ناکامی اور افسوس کی حالت ہے۔ اس کے لئے ہمیں عالموں
کے پاس جانے کی ضرورت نہیں بلکہ شاعروں اور مورخوں کے پاس
کیونکہ وہ انسانی ذات کا خاکہ کھینچتے ہیں۔ بڑے بڑے شہروں کا حال
دیکھو کیسے گناہ و جرم ہوتے چلے جاتے ہیں خادمانِ دین اور دوسرے

مصلح برابر چلا رہے ہیں کہ لوگ لاپرواہ ہوگئے ہیں اور اخلاقی مقاصد سے
دور جا پڑے ہیں۔ شاید ہم میں سے ہر ایک یہ افسوسناک نظارہ مشاہدہ
کر چکا ہے۔ بڑے بڑے بزرگوں اور مقدسوں کی زندگی ایسے امر کی
شاہد ہے۔ بے شک ایسی کمزوریوں کے لئے عذر تو پیش کئے جاتے
ہیں جتنی اعلےٰ تعلیم اور جتنا اعلےٰ معیار ہوا اتنا ہی زیادہ ہم اپنے نقصوں
کو معلوم کرتے ہیں ٭

بعض معلمانِ اخلاق نے یہ کہا کہ "مسیح نے اس اعلےٰ اور سادہ عقیدہ
میں جو اس نے صاف طور سے بیان کیا ہے ہمیشہ کی زندگی کا وعدہ
اُن سے کیا ہے جو خدا کو اپنے سارے دل سے پیار کرتے ہیں اور
اپنے پڑوسیوں کو اپنے جیسا اور جو پاکیزگی فروتنی ہمدردی میں زندگی
بسر کرتے ہیں"۔ بے شک ہمارے خداوند نے ایک موقع پر یہ کہا تھا
کہ "یہ کر تو تو جئے گا"۔ لیکن شک ہے کہ یہی سارا عقیدہ نہ تھا۔ جب یہ معلم
ایسے کمال کو نجات کا وسیلہ ٹھہراتے ہیں تو چاہیئے کہ ان کا دل دہل جائے
کیونکہ اگر نجات اس بات پر موقوف ہوتی کہ ہم خدا کو اپنے سارے دل سے
اور اپنے پڑوسی کو اپنے جیسا پیار کریں تو کس کو نجات کی امید رہتی۔ جس
شخص کو ہمارے خداوند نے یہ الفاظ کہے تھے کہ "یہ کر تو تو جئے گا" اُس
نے اپنے تئیں صادق ٹھہرانے کے لئے یہ بھی پوچھا کہ میرا پڑوسی کون
ہے اور نیک سامری کی تمثیل کے ذریعہ اُس کو جواب دیا۔ جس سے
وہ قائل ہو گیا کہ اس دوسرے حکم کو پورا کرنے کی بجائے اُس کے ادا کرنے
میں وہ قاصر رہا ہے۔ دوسرا مصنف یہ نعرہ بلند کرتا ہے کہ "یسوع کے
معقول و دلچسپ طریقہ کو میں نے دریافت کر لیا ہے" اس کے خیال میں

وہ یہ ہے کہ اپنے اندر نظر ڈالیں اور خواہشات نفسانی کو ترک کریں۔ انہیں دو باتوں کو وہ انجیل کا خلاصہ اور راستبازی کا وسیلہ ٹھہراتا ہے۔ مگر بیمار کو یہ کہنے سے کیا فائدہ کہ اگر وہ چلے تو تندرست ہو جائے گا۔ بیماری کا ایک نتیجہ تو یہی ہے کہ وہ چل نہیں سکتا ویسا ہی گناہ آلودہ اور بگڑے انسان کو یہ کہنا کچھ فائدہ نہیں دیتا کہ یہ یا وہ کام کر تو نیک بن جائیگا اس سے ظاہر ہے کہ ایسے معلم ایک بڑی ضروری بات کو نظر انداز کر جاتے ہیں چنانچہ ایک معلم کہتا ہے کہ "انجیل میں ایسی باتیں ہیں جن کی نسبت بہت کم اختلاف ہو سکتا ہے مثلاً یہ کہ خدا باپ ہے اور ہم سب بھائی ہیں۔ اس تعلیم کے سکھانے کے لئے کسی پادری کی ضرورت نہیں اور نہ اس امر کی تصدیق کے لئے کسی بشپ کی۔ باقی جو کچھ ہے وہ عملی طور پر بہت ضروری نہیں"۔ باقی تعلیم جس کو یہ معلم عملی طور پر ضروری نہیں ٹھہراتا۔ غلطیوں۔ گناہوں۔ عجز توبہ کمزوری اور روحانی لڑائی کا ذکر کرتی ہے ٭

مسیح اور اس کے رسولوں کی تعلیم میں ایک طریقہ تو تھا جو عام معلم شاید پسند نہ کرتا۔ لیکن اسی طریقہ سے وہ کامیاب ہوئے جب مردوں عورتوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا تب انہوں نے نجات کے وسائل کو قبول کیا البتہ بعض ایسے سخت لوگ بھی تھے جنہوں نے نہ اپنے گناہوں کا اقرار کیا اور نہ وسائل نجات کو قبول کیا اسی طریقہ سے اب بھی مسیحی تعلیم کی ترقی ہو سکتی ہے۔ کسی اثباتی دلیل سے یہ امر ثابت نہیں ہو سکتا لیکن صرف مشاہدہ اور تجربہ کی بات ہے۔ اقلیدس کے علوم متعارفہ کا انکار کوئی سلیم العقل شخص نہیں کرسکتا۔ ویسا ہی اخلاقی علوم متعارفہ کا انکار کوئی نیک شخص نہیں کرسکتا اور دین کے اصول تو ایسے ہیں

کہ جو شخص روزمرہ کے امور زندگی سے واقف ہے یا اپنے دل کی حالت سے آگاہ ہے وہ ہرگز انکار نہ کریگا۔ جب واعظ منبر پر سے ہماری کچھ شکایت کرتا یا ہم پر کچھ الزام لگاتا ہے تو فوراً دل میں یہ خیال طبعاً پیدا ہوتا ہے کہ اس الزام کا انکار کریں۔ لیکن اگر ہم یہ سوچیں کہ مسیح کے سامنے ہم کھڑے ہیں اور وہ نہ قاضی کی حیثیت سے بلکہ نجات دہندہ کی حیثیت سے ہمیں یہ کہتا ہے کہ اپنے دلوں کے بھید ہم پر ظاہر کردو تاکہ میں ان برائیوں سے تم کو مخلصی دوں تو کون ایسا سنگدل ہے کہ مرض موذی کی طرح چھپاتا رہیگا۔ جیسے آپ بھول کو مان لیتا ہوں اور میری خطا ہمیشہ میرے سامنے ہے" وعدہ صادق شدہ کلیہ یا قول ہے جب موروثی گناہ پر زور دیا تو وہ محض آپ کی رائے نہ تھی بلکہ ایک امر واقعی تھا کیونکہ انسانی ذات میں اس قسم کا مزاج پایا جاتا ہے۔ اس موروثی یا پیدائشی گناہ کا دیوانی مسئلہ میں ذکر ہے۔ کون انکار کر سکتا ہے یہ تو تجربہ کی بات ہے کہ بچے پیدا ہوتے ہی بدی کی طرف مائل پایا جاتا ہے۔ ہم میں ایک رغبت پائی جاتی ہے خواہ اس کو نفسانی حکومت۔ نفسانی ہوس نفس کا میلان خواہ نفس کی رغبت کہو جو خدا کی شریعت کے تابع نہیں۔ یہ صرف عالموں کی باتیں نہیں۔ یہ روزمرہ کے مشاہدہ کی باتیں ہیں ٭

میں اس بات کو مانتا ہوں کہ عالم لوگ معمولی واقعی امور کو ایسے طور سے بیان کرتے چلے جاتے ہیں کہ وہ رائیں بن جاتی ہیں اور چونکہ یہ رائیں کبھی بیشی کی طرف مائل ہوتی ہیں اور ایک نہ ایک وقت یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ اس رائے میں یہ نقص یا غلطی ہے تو وہ ساری رائے رد کی جاتی

ہے اور جو امور واقعی بجزوی طور پر اس راستے کے ذریعہ بیان ہوتے تھے اُن
کا بھی لوگ انکار کرنے لگ جاتے ہیں۔ لیکن میں یہ بھی کہے بغیر نہیں رہ
سکتا کہ باوجود ان نقصوں کے جو ان راؤں میں پائے جاتے ہیں ان عالموں
نے یہ تو معلوم کر لیا تھا کہ نوع انسان میں کیسی بدی پائی جاتی ہے۔ ایسا بوجھ
سے جو ایک طرح کا بوجھ ان کے دل پہ آپڑا تھا اس کو ہٹانے کے لئے انہوں
نے یہ کوشش کی کہ کتاب مقدس سے ایک مفصل الٰہی انتظام کو دریافت کریں
اس میں وہ قاصر رہے۔ اس قاصر رہنے سے بعضوں پر تو یہ الٹا اثر پڑا کہ
انہوں نے اس گناہ کا ہی انکار کیا۔ چونکہ انسان میں بدی پائی جاتی ہے
خواہ عالم مانیں یا نہ مانیں عوام الناس ان راؤں کے گرویدہ ہیں جو ان صاحبان
کی رائیں ہم تک پہنچی ہیں وہ جیسے دانا اور دوراندیش تھے۔ اگرچہ اُن کی اقوال
کو اب لوگ نہ مانتے ہوں لیکن انہوں نے سچائی کا کوئی نہ کوئی پہلو تو دکھا دیا
اس لئے اب ان مختلف پہلوؤں پر نظر ڈال کر حقیقت کو بہت کچھ معلوم
کر سکتے ہیں۔ مسیحی کلیسیا اس امر میں برابر ترقی کرتی جا رہی ہے اور ایک دن
پورا مکاشفہ اسے حاصل ہوگا ۔۔

اب میں چند دینی اصطلاحوں کا ذکر کرونگا۔ اگرچہ بعضوں نے ان کو بھی
بہت تنگ کر دیا ہے لیکن میں یہ کوشش کرنا چاہتا ہوں کہ اصلی معنی دریافت
ہو جائیں۔ اول لفظ "نجات" کو لیجئے اور یہ محاورہ "نجات کا انتظام" ایسے
بُرے طور سے استعمال ہوا کہ بہت لوگ یہ لفظ سنتے ہی کہنے لگتے ہیں کہ یہ
بناوٹی بات ہے۔ معترضوں نے لفظ نجات کی بابت خیال کیا کہ مسیحی
عالموں کی اس لفظ سے مراد ہے کسی بہتر یہ خفیہ تقدیر کے پیچھے سے روح
کا خلاصی پانا اس لئے معترضوں نے سمجھا کہ یہ ساری بات ہی غلط ہے

پس میں چاہتا ہوں کہ ہم اس لفظ کے معنی مقدس نوشتوں ہی سے
دریافت کریں۔ انجیل میں یوں آیا ہے "تو اس کا نام یسوع رکھنا کیونکہ وہ
اپنے لوگوں کو ان کے گناہوں سے بچائیگا" انسان کی خراب حالت کا ذکر
جو پہلے ہو چکا ہے اس کو مدنظر رکھنے سے اس جملہ کے معنی کیسے دانانہ
اور پُر تاثیر ہو جاتے ہیں۔ پھر لفظ نجات میں آئندہ کا خیال بھی داخل ہوا کہ
جب ہم ان دنیاوی تعلقات اور اغراض سے علیٰحدہ ہو کر اپنے کئے کا پھل
پانے والے ہوں گے۔ فتوئی ہم پر جاری ہونے والا ہوگا۔ اس آخری
فتوے سے خلاصی پانا بھی نجات کہلایا لیکن ابتدائی معنی لفظ نجات کے
یہی ہیں اُن گناہوں سے رہائی پانا جو ہم پر بوجھ کی طرح بھاری ہو گئے تھے
ان سے نہ صرف ہماری تمیز کو تکلیف تھی بلکہ وہ ہماری روحانی کوششوں
میں رکاوٹ تھے۔ ان کی یاد بھی ہمیں سخت معلوم ہوتی ہے۔ اب سوال
یہ ہے کہ ہم ان گناہوں سے چھٹکارا پا سکتے ہیں یا نہیں۔ یا دوسرے
لفظوں میں یوں کہئے کہ ہماری روحیں شفا پا سکتی ہیں اور خدا کے ساتھ
پھر اتحاد حاصل کر سکتی ہیں یا نہیں۔ اس کے سوچنے سے عقل حیران
ہو جاتی ہے۔ روزمرہ کے کاموں میں مصروف رہ کر اس سوال کو وقت
تک ملتوی کر دیتے ہیں لیکن کسی نہ کسی وقت یہ سوال اُٹھ کھڑا ہوتا ہے
کہ میری روح کا کیا حال ہوگا۔ میری کمزوری کا کیا نتیجہ ہوگا۔ میرے گناہوں
کا کیا ثمرہ ہوگا۔ مجھے ان سے کیسے نجات مل سکتی ہے۔ بڑھاپے میں جب
دیگر کاروبار کا زور گھٹ جاتا ہے یہ خیال بار بار آتا اور دل کو گھبرا دیتا ہے۔
اور جہاں کہیں ذرا بھی تسلی ملتی ہے اس کو قبول کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں
کہ ایک دن یونہی چھٹکارا مل جائے گا۔ لیکن بعض انہی روحوں کی سخت

بیماری سے ایسے قائل ہیں کہ وہ شفا ناممکن سمجھتے ہیں۔ مسیحی دین ایک طرح
سے ان دونوں خیالوں کی تائید کرتا ہے کہ گناہ کیسی مہلک شے ہے
اور اُس سے چھٹکارا کیسا مشکل ہے دوسری طرف کامل اطمینان اور
خوشحالی کا وعدہ کرتا ہے۔

یہاں تک تو مشاہدہ اور فلسفہ کے مطابق بیان ہوا اب ہم ذرا
اُس روحانی جہان کا خیال کریں جس کا ذکر شروع میں ہوا تھا۔ ہم کو ایک
مشخص وجود کے سامنے حاضر ہونا ہے جس کی قدوسیت سچائی اور انصاف
غیر محدود اور بے لوث ہے۔ تمیز تو اُس نور کی ایک دھیمی آواز ہے۔
اور جو شرمساری گناہ کے باعث اِس وقت ہوتی ہے وہ اُس شرمساری
کا شمہ بھی نہیں جو خدا کے سامنے اپنے قصوروں کے باعث اٹھانی
پڑے گی۔ اُس الٰہی وجود سے جب انسان کو سامنا پڑے گا تب کامل
شرمساری خاکساری پیدا ہوگی۔ ذرا سوچو کہ جب خدا کی شعلہ زن آنکھیں
ہمارے دل و دماغ کے کونے کونے کو پڑتال کریں گی۔ نہ صرف عمل
کے گناہ بلکہ پوشیدہ گناہ بھی ظاہر ہو جائیں گے۔ نہ صرف افعال بلکہ
نیات۔ نہ صرف الفاظ بلکہ خیالات بھی اُس تخت عدالت کے سامنے
روشن ہو جائیں گے تب ہماری کیا حالت ہوگی۔ مسیحی دین کے مکاشفہ
کا یہ پہلا درجہ ہے۔

اسی قسم کا مکاشفہ اسی قسم کے مقصد کے لئے مسیح نے پہاڑی
وعظ میں دکھایا۔ بے شک وہ وعظ اخلاق کا اشتہار ہے۔ جو کوئی اُسے
غور سے پڑھے گا اُس کے دل میں آئندہ عدالت کا ہولناک نظارہ بھی
گزر جائے گا۔ وہ آواز بڑے اختیار سے پکار کر کہتی ہے "تم نے سنا کہ

اگلوں سے کہا گیا تھا تو خون نہ کرنا۔ پر میں تمہیں کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنے بھائی
پر بے سبب غصہ ہو عدالت میں سزا کے قابل ہوگا۔ تم سن چکے ہو کہ اگلوں
سے کہا گیا تھا تو زنا نہ کرنا پر میں تمہیں کہتا ہوں کہ جو کوئی بُری شہوت سے کسی
عورت پر نگاہ کرے وہ اپنے دل میں اُس کے ساتھ زنا کر چکا۔ جب تک
آسمان و زمین ٹل نہ جائیں۔ ایک نقطہ یا ایک شوشہ توریت کا ہرگز نہ مٹیگا
جب تک کہ پورا نہ ہو۔" اِس آواز کے سامنے آئندہ فتویٰ کے خیال سے دل
کانپ اٹھتا ہے۔

مقدس پولوس اپنا پیغام یا انجیل اسی طرح شروع کرتا ہے "خدا کا
غضب ان انسان کی تمام بیدینی اور ناراستی پر جو کہ سچائی کو ناراستی سے روک
دیتے ہیں آسمان سے ظاہر ہے۔" ایسے مکاشفہ کے لئے کسی بیرونی ثبوت
کی ضرورت نہیں یہ خود بخود ظاہر ہے جنہوں نے ہمارے نجات دہندہ
سے یہ وعظ سنا انہوں نے اقرار کیا کہ وہ اختیار سے بولتا ہے اور جب رسول
نے ایسی بات کا اشتہار دیا تب سننے والوں کی تمیز نے گواہی دی کہ
یہ سچ بول رہے ہیں۔ کبھی ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ ہم دور کی چیز کو نہیں دیکھ
سکتے لیکن ہمارا رفیق جو ہم سے زیادہ دوربین ہے دیکھ کر ہم کو بتا دیتا ہے
ہم فوراً مان لیتے ہیں۔ ویسا ہی جب مقدس نوشتے تمیز کی آگاہی کی تشریح
کرتے ہیں تو ہمارے دل فوراً اس تشریح کو مان لیتے ہیں کہ اگر روح کی قوتیں بالکل
کند نہ ہو گئی ہوں تو اُس مکاشفہ کی روشنی میں ہم اپنے تئیں ایک ایسی بھسم
کرنے والی آگ کے حضور پاتے ہیں جس کے سامنے ہر بیہودہ اور خراب شے
جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔ اب نجات کا بیان جو نوشتوں میں ہوا ہے اور کلیسیا نے
اُس کی تعلیم دی ہے وہ کیا اچھی طرح سمجھ میں آجائے گا اور وہ بنا دی معلوم ہوگا۔

خدا کا غضب کبھی بھڑکے لیکن اس کی تاثیر صحت بخش ہے پس اس سے رشتہ حاصل کرنے کی خواہش قابل تعریف ہوگی۔ اگر انسان اعلٰے مقصد کو مدنظر رکھے تو بدی سے مخلصی پانے اور اس کے نتائج سے بچنے کے لئے متواتر کوشش کرنے سے باز نہ رہیگا ۔۔

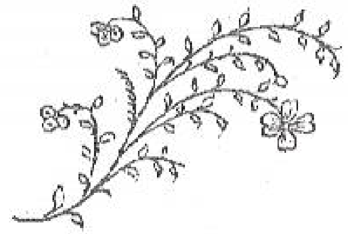
الغرض جن امور پر ہم غور کر رہے ہیں وہ انسانی زندگی کا ایک خاصہ ہے فرض کرو کہ کسی شخص پر انسانی عقل و جذبات کا حال منکشف ہو جائے تو وہ فوراً یہ نتیجہ نکالے گا کہ زندگی ایک لڑائی ہے اور اس لڑائی میں جو زبردست اور لائق ہیں وہ بچ رہتے ہیں اور اپنی نوع کو قائم رکھتے ہیں کل کی ترقی ہوتی جاتی ہے۔ خواہ بعض افراد کی ترقی نہ ہو۔ یہ ممکن ہے کہ آدمی سارے جہان کو حاصل کرے اور اپنی جان کھو دے۔ لیکن پھر بھی وہ بہرحال کسی نہ کسی طرح سے اپنے ہم جنسوں کی ترقی کا باعث ہوگا مثلاً لڑائی۔ قانون یا علم میں۔ خواہ وہ کبھی بدی یا کمزوری کا شکار بنا رہے۔ اُس کی عقل کا کام یا ہاتھوں کی محنت اُس کی نوع کی قدر ہو چکی ہے۔ کچھ مضائقہ نہیں کہ اس کی اپنی شخصی حالت کیسی تھی۔ لیکن اس دیدہ جہان کے پیچھے ایک اور جہان ہے۔ یہ ہماری نظروں سے تو غائب ہے لیکن ہمارے دیدہ جہان سے کہیں وسیع ہے۔ ساری روحیں جو ایک دفعہ اس دیدہ جہان میں آئیں ان سب کا شخصی تعلق اُس وجود سے ہے جو نہ صرف مسیحیوں کو بلکہ ہر ایک کو جو اس جہان میں آتا ہے روشن کرتا ہے۔ ہر دیگر شے سے اس کا تعلق قطع ہو گیا ہے اور ہمارا تعلق بھی قطع ہو جائیگا لیکن جو تعلق اُس وجود سے تھا وہ قطع نہیں ہو سکیگا اس کا نتیجہ ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ جس پوشیدہ کتاب میں ان کا ذکر ہے۔ اسی میں اس بات کا ذکر ہے کہ ایک کا دوسرے پر کیا اثر ہوا تھا۔ ہم نے کس قسم کی آزمائشیں اپنے

بھائیوں کے سامنے رکھیں ہم نے کہاں تک دوسروں سے وفا یا بیوفائی کی۔ یہ تاثیریں روز عدالت تک برابر اپنا کام کرتی جائینگی اسی وجہ سے کسی نے کہا ہے کہ چو آہنگ رفتن کند جان پاک ۔ چہ بر تخت مُردن چہ بر روئے خاک ۔۔ یعنی موت کے وقت ایک طرح سے سب ساوی ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ ہر ایک کے واسطے یہی سوال رہ جاتا ہے کہ اس کا تعلق حق اور ناحق خدا کی شرع اور خود خدا سے کیا ہے۔ یہ وہ دوسرا جہان ہے جس کو حاصل کرنے کے لئے مقدس لوگ اس دیدہ جہان سے بھاگتے پھرے یہ دکھ تکلیف جو اُنہوں نے اُٹھائے وہ ایک طرح سے اُن کی سزا کا جزو تھے اور یہ ہماری تمیز کا ہی کام ہے کہ ہم اس جہان کو درست طور پر برتیں۔ اور جو اس میں خوبیاں ہیں اُن کو ترقی دیں۔ اگر اس تمیز کا خیال چھوڑ دیں اور اس سے قطع تعلق کریں۔ تب یہ جہان محض ایک لڑائی رہ جائیگا۔ جس میں جس کی لاٹھی اُس کی بھینس کا معاملہ ہے ۔۔

بائیبل اور مسیحی دین کا یہ خاصہ ہے کہ وہ اس اندرونی جہان کے مشاہدہ پر زور دیتے ہیں اور بعضوں نے یہی الزام ان پر لگایا کہ یہ موجودہ جہان کے امور کا لحاظ کافی طور سے نہیں کرتے اور یہ کچھ سچ بھی ہے کیونکہ زیادہ تر وہ اُسی نصف زندگی کا لحاظ کرتے ہیں جو ازل تک رہنے والی ہے۔ اور جس کا تعلق اُس خدا سے ہے جس میں ہماری تمیز (کانشنس) چلتی پھرتی اور زندہ رہتی ہے۔ پس جب کوئی یہ کہتا ہے کہ مسیحی دین میں صرف ہماری رفتار اور چال چلن کے قوانین ہی کا ذکر ہے وہ ہی غلطی کرتا ہے کیونکہ ان قوانین کا ذکر پیچھے ہے۔ پہلے روحانی جہان یا آسمان کی بادشاہت کا مکاشفہ ہے۔ اور اس لئے وہ پہلے محبت اور سچائی پر زور دیتے ہیں کیونکہ باقی

ساری رفتار نہیں پر موقوف ہے جیسا لکھا ہے کہ محبت ساری شریعت انبیاء کی تکمیل ہے۔ اگر کوئی کہے کہ مقدس نوشتوں میں حب۔ تقویٰ کا ذکر نہیں تو اس کی یہ وجہ ہے کہ مقدس نوشتے مدبران ملک کی نسبت اعلےٰ جہان کا فکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر آدمی اپنے خدا کے ساتھ راست رہے تو وہ کسی انسان کے ساتھ ناراست نہیں ہو سکتا۔ اگر مقدس نوشتے گناہ کے علاج اور غلطی کی اصلاح کا ذکر نہ کرتے تو وہ انسان کی حاجت کو رفع نہ کر سکتے نہ لوگوں کے دلوں میں وہ جوش اور سرگرمی پیدا ہوتی جب یہ مکاشفہ ہاں کہ "خدا کا برہ جہان کے گناہ اٹھائے جاتا ہے" یعنی ماضی۔ حال اور مستقبل گناہوں کو۔ تب اس کی تاثیر گنہگار مردوں عورتوں کے دلوں پر نقش ہوئی باوجودیکہ ان کو سخت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ دیگر کتابوں اور مذہبوں میں شاید اس قسم کی اخلاقی تعلیم مل جائے لیکن کسی جگہ مجروح کے ایسے گہرے زخم اور ان زخموں کا علاج نظر نہیں آتا۔

اب یہ بتانا رہ گیا کہ وہ کیا علاج ہے اور اس کی کیا تاثیر ہوتی ہے۔ چھٹے باب میں کفارہ کا ذکر ہے اور مابعد دو بابوں میں اس کفارہ کی تاثیر کا یعنی راستباز ٹھہرنے اور پاکیزہ بننے کا ذکر ہے۔



چھٹا لکچر

کفارہ کا اصول۔ ۱ یوحنا ۲: ۱ و ۲

"اے میرے بچو میں یہ باتیں تمہیں لکھتا ہوں تاکہ تم گناہ نہ کرو اور اگر کوئی گناہ کرے تو یسوع مسیح جو صادق ہے باپ کے پاس ہمارا شفیع ہے اور وہ ہمارے گناہوں کا کفارہ ہے"۔

پچھلے لکچر میں یہ ذکر ہوا کہ ہر مذہب اور فلسفہ کو انسان کی موجودہ حالت کا لحاظ کرنا چاہئے اس لئے چال چلن کے قوانین ٹھہرانے کی ضرورت نہیں بلکہ اس بات کی ضرورت ہے کہ جو بدی دنیا میں پھیل رہی ہے اس کا علاج کس طرح سے ہو سکے اس لئے یہ بتانا ضرور نہیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ یہ تو ہم کو بہت کچھ معلوم ہے بلکہ اس بات کو سوچنا ہے کہ کیوں انسان نیکی کرنے میں قاصر رہتا ہے۔ اگر انسان میں ایک مستقل تمیز کا شخص نہ ہوتی تو ہم یہ کہہ سکتے تھے کہ یہ ہماری ذات کا ایک نقص ہے۔ پودے یا حیوان میں جو نقص کس قسم کا ہو اس سے کوئی مستقل نقصان اس شے کو نہیں پہنچتا اور حیوانات کے دکھوں کے بارہ میں ایک تو یہ بات ہے کہ ان کے دکھوں اور جدوجہد سے کل جنس کو فائدہ پہنچتا ہے دوم یہ ہے کہ ادنےٰ حیوانات میں شاید اپنے دکھوں اور نقصوں کا علم اور پہچان بھی نہیں یہ دقت صرف اسی لئے ہے کہ ایک مستقل تمیز ہے اور آدمی اپنی حالت

کو جاتا ہے اور اسے تمیز حاصل ہے اس لئے یہ مشکل پیش آتی ہے یہی وجہ ہے کہ رُوح جاگ اٹھتی ہے اور افسوس کرتی ہے کہ مجھے کیسا ہونا چاہئے تھا اور کیا کرنا چاہئے تھا اور یہ بھی محسوس کرتی ہے کہ میرا رشتہ خدا کے ساتھ درست نہیں رہا ہے۔ یہ بیماری ہے۔ اس کا علاج درکار ہے۔ اب ہمیں یہ ظاہر کرنا ہے کہ کفارہ کی تعلیم اس تجربہ انسانی کے کہاں تک موافق ہے۔ لیکن شروع میں اس بات کو سوچیں کہ کیونکر اس تعلیم کی بنیاد ایک شخص کے دیدہ دانستہ دکھوں اور غموں پر ڈالی گئی۔ مسیح نے نوع انسان کے وکیل۔ سر اور خداوند ہونے کا دعوے کیا۔ اس دعوے کی ایک بڑی وجہ تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ شروع ہی سے نوع انسان کے طبعی اور اخلاقی دکھوں اور تکلیفوں کا تجربہ کرتا ہے۔ وہ نوع انسان کے گناہوں اور دکھوں کے بوجھ کو اپنے اوپر اٹھا لیتا ہے تاکہ موت کا پیالہ پیئے۔ لکھا ہے کہ اس کو یہ مناسب تھا کہ جب بہت سے فرزندوں کو جلال میں لائے اُن کے نجات کے پیشوا کو دکھوں سے کامل کرے۔ یاد رہے کہ جب میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ مسیحی تعلیم انسانی حاجتوں کے مطابق ہے تو میں یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ جس ترتیب سے اس تعلیم کا بیان بائبل میں آیا ہے اسی سلسلہ و ترتیب سے میں بیان کرتا ہوں۔ بائبل کے جس حصہ میں کفارہ کی تعلیم کا مفصل بیان ہے وہ عبرانیوں کی طرف کا خط ہے اور یہ الفاظ میں نے اُسی خط کے دوسرے باب سے لئے ہیں۔ اس خط کا مصنف شروع ہی میں یہ ظاہر کرتا ہے کہ مسیح ہماری کمزور فانی حالت میں ہماری مانند بن گیا۔ وہ انہیں بھائی کہنے سے نہیں شرماتا۔ پس جس حال کہ لڑکے

گوشت اور خون میں شریک ہیں ویسا ہی وہ بھی ان میں شریک ہوا تاکہ موت کے وسیلے ان کو نیست کرے جس کے پاس موت کا زور تھا ......

ضرور تھا کہ وہ ہر ایک بات میں اپنے بھائیوں کی مانند بنے تاکہ وہ ان باتوں میں جو خدا سے نسبت رکھتی ہیں لوگوں کے گناہوں کا کفارہ کرنے کے واسطے ایک رحیم اور دیانتدار سردار کاہن ٹھہرے کیونکہ جس حال اُس نے آپ ہی امتحان میں پڑ کے دکھ پایا تو وہ اُن کی جو دکھ میں پڑتے ہیں مدد کر سکتا ہے ۔

ہم ایک قدم اور آگے بڑھا سکتے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ مصنف خط اس شخص کا بیان کر رہا ہے جو باپ کے جلال کی رونق اور اُس کی ماہیت کا نقش ہے۔ پس خدا کا ایسا مکاشفہ کہ وہ گویا خود ہی ہمارے غموں میں بلکہ ایک طرح سے ہمارے گناہوں میں شریک ہوتا ہے اُس وجود کے ماننے کی دقت کو بہت کچھ گھٹا دیتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم ایسے خدا کو نہ تو پیار کر سکتے ہیں اور نہ اس پر بھروسہ رکھ سکتے ہیں جو خود تو آسمانوں پر امن چین سے رہے اور انسانوں کو اپنے قانونوں کے مطابق اس جدوجہد میں تنہا چھوڑ دے کہ وہ ابد تک ان نقصوں کے نتائج کی برداشت کرتے رہیں جو نقص اُس نے خود ہماری ذات میں رکھ دیئے ہیں۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ یہ مشکل مسیحی تعلیم سے بالکل رفع ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جب اور بیشمار مشکلات امور زندگی اور سائنس میں پائی جاتی ہیں تو کچھ تعجب نہیں کہ اس بڑے مسئلہ میں ان سے بڑھکر مشکل پائی جائے۔ لیکن جب ہم اس بات کا اشتہار دیتے ہیں کہ خدا نے اپنی مخلوقات کے گناہوں اور غموں کو اپنے اوپر لے لیا اور وہ بھی اس شدت سے کہ ہمیں ویسا سخت

تجربہ ہی نہیں ہوا تو انسانی تمیز کا وہ اعتراض بہت کچھ تو حل ہو جاتا ہے۔ ابھی تک ہم دریافت نہیں کر سکے کہ دکھ کیا ہے۔ یا یہ کہ خدا جسم میں ظاہر ہو سکتا ہے لیکن جہاں تک ہماری تمیز اور دل کا تعلق ہے وہاں تک یہ مسئلہ کہ نیک خدا کی خلقت میں بدی پائی جائے اس تعلیم سے قدرے حل ہو جاتا ہے کہ خود خدا نے ہماری بدی کا نتیجہ اُٹھایا۔ خدا مخلوق بن گیا اور اس کی سیرت انسان کی سیرت کے مطابق ظاہر ہوئی۔ اس لئے یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ خدا ہی نے جہان کے گناہوں کو اپنے اوپر اُٹھا لیا۔

مسیحی دین کے معترض یہ کہتے ہیں کہ ہمیں کفارہ کی ضرورت نظر نہیں آتی۔ اگر ضرورت بھی ہو تو بھی کفارہ کا امکان نہیں۔ پہلے سوال کے متعلق یہ یاد رکھیں کہ ہم خود مختار اور ذمہ وار ہیں اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ہمارے افعال محض اتفاقی ہیں یا موروثی یا مجبوری ہیں تو خدا کے سامنے کفارہ دینا بے معنی ٹھہرے گا۔ ان صورتوں میں گناہ بھی خلاف شرع نہ ہوگا بلکہ ایک ذاتی نقص ہوگا جس سے اتنا پتہ لگے گا کہ یہ حالت نشو ونما میں ہے اور سزا صرف اس نقص کا نتیجہ ہوگی اور ٹھیک طرح سے وہ سزا کہلانے کے مستحق نہ ہوگی۔ اس بیان میں قدرے سچائی ہے۔ اور فعل مختاری بھی ایک طرح سے جزوی مختاری ہے اس لئے گناہ کا اور بھائیوں کے قصوروں کا اندازہ لگانے میں اس کو یاد رکھنا چاہیئے۔ کسی گناہ کی شدت سے اس کی ذمہ واری کی شدت ظاہر نہیں ہوتی۔ لیکن اس امر پر اتنا زور نہ دیا جاوے کہ جس سے یہ نتیجہ نکلے کہ ہم خدا کے سامنے ذمہ وار نہیں یہ تو غلط ہوگا کیونکہ اگر خدا کے سامنے ذمہ وار نہیں تو ایک دوسرے کے سامنے بھی ذمہ وار نہیں اس لئے اپنی غلطیوں کی تلافی کرنا ضرور نہیں۔

جن امور کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور جن کے ذریعہ ہم نے مسیحی تعلیم کی تشریح کی ہے انہیں امور کی طرف ہم پھر رجوع کریں۔ جب ہم ایک دوسرے سے ناحق کرتے ہیں تو کیا ہم عموماً اپنے تئیں ذمہ وار محسوس نہیں کرتے؟ اور اس کی تلافی کرنا اپنا فرض نہیں سمجھتے اگر آزاد مرضی یا فعل مختاری نہ ہوتی تو اس قسم کا خیال بھی پیدا نہ ہوتا۔ شاید ہم اپنی کمزوری کے نتائج پر بہت افسوس کرتے اور ان کی تلافی کرنے کی کوشش کرتے۔ لیکن جب ہماری تمیز یا کانشنس جاگ اٹھتی ہے تو جن سے ہم نے ناحق کیا ہے اُن کی طرف سے بالکل متفرق خیال دل میں پیدا ہوتا ہے۔ آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ میں خود مجرم ہوں کہ جو مجھے نہیں کرنا چاہیئے تھا وہی میں نے کیا اور میں ایسا کرنے کے لئے مجبور بھی نہ تھا اور میں ایسے فعل کے لئے اپنے تئیں معذور بھی نہیں سمجھتا اس حالت میں ہم اپنے تئیں فعل مختار ہی سمجھتے ہیں اور ہمارا دل الزام لگاتا ہے کہ ہم نے اپنے اختیار کو غلط استعمال کیا۔ اگر یہ خیال درست ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ برتاؤ رکھنے میں اپنے تئیں ذمہ وار سمجھتے ہیں تو کیوں خدا کے رشتوں میں اس صفت کو خارج کریں۔ میں یہ مانتا ہوں کہ یہ مسئلہ مشکل ہے اور یہ مشکل صرف مسیحیوں کے لئے ہی نہیں بلکہ ہر مذہب اور فلسفہ میں یہ مشکل پیش آتی ہے کہ ظاہرا فعل مختاری اور قانون جبر کو تطبیق دیں۔ ہم صرف تمیز کے متعلق امور پر لحاظ کرینگے۔ ہم اپنے دل میں محسوس کرتے ہیں کہ ہم اپنے ہمجنسوں کے لئے ذمہ وار ہیں اور کوئی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ اس لئے ہمیں مجبوراً تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ ذمہ واری ہماری کل ذات سے متعلق ہے اور ہماری فطرت میں داخل ہے۔ اس نقطہ سے شروع کرنا کچھ عجب معلوم ہوگا کیونکہ تجربہ تو یہ ہوا ہے کہ ذو فطرت کی بابت

کے مطابق انسان تقریباً ہمیشہ محسوس کرتا ہے کہ میں **الٰہی قدرت**
کے سامنے ذمہ دار ہوں - اور اپنے قصوروں کا کفارہ دیتا ہے - یہودیوں
میں قربانی کا رواج نوع انسانی کے عالمگیر دستور کی تشریح ہے - مگر عام دستور
اس عقیدہ کا ثبوت ہے جس پر وہ دستور مبنی ہے تو شاید قربانیوں کا دستور قدیم
دستوروں سے زیادہ مروج رہا ہے اس لئے یہ دستور کفارہ کی ضرورت کی
تائید کرتا ہے پھر بھی میں اس دلیل پر زور نہیں دیتا کیونکہ میں تواریخ سے شہادت
پیش نہیں کر رہا ہوں بلکہ تجربہ سے - لیکن اگرچہ قربانیوں کا رواج بہت کچھ بگڑ
گیا پھر بھی یہ قرین قیاس ہے کہ اس دستور میں ایک حقیقت کا تو اظہار ہے
گو جزوی طور پر ہو - یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ ایسا عالمگیر رواج محض خیالی پلاؤ ہے
جب لوگوں میں یہ پہچان ہو کہ ہمارا خدا سے رشتہ ہے اور ہم اُس سے
وفادار نہیں رہے جیسے کہ اپنے بھائیوں سے وفادار نہیں رہتے تو کسی قسم
کے کفارہ کا خیال ضرور آئیگا - گو اس قسم کا خیال آجکل قوانین فطرت کے
سامنے بہت موہوم ہو گیا ہے تو بھی ہم باہمی شخصی رشتہ سے دلیل لا
سکتے ہیں کیونکہ باہمی ذمہ داری کا خیال آزاد مرضی یا فعل مختاری پر دلالت
کرتا ہے اور کفارہ کی ضرورت کو ظاہر کرتا ہے ۔

اگر اس دلیل کو مان لیں اور یہ سمجھ میں آجائے کہ ہم نے اپنا فرض
ادا نہیں کیا اور پھر جب یہ معلوم ہو جائے کہ جس کا فرض ہم نے ادا نہیں
کیا اور جس کو ہم نے رنجیدہ کیا ہے وہ خدا باپ ہے جو ہمارے دلوں میں
محبت اور رحمت کے ولولے پیدا کر رہا ہے تو اس قصور کی شدت چند
در چند ہو جائیگی - اب میں اس مسئلہ کے دوسرے پہلوؤں پر غور کرونگا -
فرض کرو کہ ہم خدا کے سامنے ذمہ دار ہیں اور اُس کا قصور ہم نے کیا ہے

اب یہ سوال رہا کہ کس طرح کوئی دوسرا شخص ہمارے عوض کفارہ دے سکتا ہے - جس
شخص نے خطا کی اگر وہ تلافی نہ کرے اور دوسرا شخص اُس کی جگہ تلافی کرے تو اس
کی کیا قدر ہو سکتی ہے ؟ اس سوال کے جواب میں اول تو یہ سوچنا چاہئے
کہ کفارہ کے بارہ میں جو مسیحی تعلیم ہے اُس میں قصوروار کی طرف سے تلافی
کرنا خارج نہیں بلکہ روحانی صحت کی بحالی کے لئے ایسے شخص کی تلافی
ایک طرح سے نہایت ضرور ہے - بیشک بعض لوگوں نے کفارہ کی تعلیم
کا ایسا بیان کیا ہے کہ وہ سزا ایسی تھی گویا بچتی کہ قصوروار شخص کو سزا اٹھانے
کی کچھ ضرورت نہیں ایسی تعلیم سے صاحب فکر لوگوں کو بہت چوٹ لگی ہے -
یاد رکھئے ایسی تعلیم بائبل کی نہیں - جو کفارہ مسیح نے دیا اُس کا بیان بائبل
میں کئی تمثیلوں کے ذریعہ کیا گیا ہے اور بعض معلموں نے ان میں سے ایک
یا دو تمثیلوں کو لے کر اُسے کفارہ کی کل تعلیم سمجھ لیا - مثلاً عہد نامہ میں مسیح
کی موت کو کبھی زرفدیہ سے کبھی پُرثواب قربانیوں سے تشبیہ دی ہے - کسی طرح
سے نتیجہ ان دونوں تمثیلوں کا یکساں ہے - گرچہ کام مسیح کی موت سے پورا
ہوا وہ اسی قسم کا تھا - لیکن چونکہ کئی مثالوں سے اُس کا بیان ہوا ہے یہی
ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی ایک کے وسیلہ اس کی پوری تشریح نہیں ہو سکتی ؟
اس تعلیم میں دو ضروری امور ہیں خواہ پولوس یا یوحنا کی تعلیم کے مطابق
لے لو خواہ عبرانیوں کے خط کی تعلیم کے مطابق - اگر ان دونوں امور کو مدنظر رکھیں
تو اس تعلیم میں مذکورہ بالا غلطی سے بچے رہینگے - امر اول جس انصاف کا
تقاضا پورا کرتا ہے وہ اشیا کے رشتوں پر مبنی نہیں بلکہ شخصی رشتوں پر مبنی
ہے - جب مجھ سے کوئی قریب رشتہ ٹوٹ گیا تو میں مجازاً یہ کہہ سکتا ہوں کہ
میں قرضدار ہو گیا ہوں - لیکن نہ حقیقت جو ناحق مجھ سے سرزد ہوئی اُس سے

کسی کا دل دکھا ہے اور یہ شخصی بات ہے اس لئے اس کا علاج بھی دل کا خوش کرنا یعنی شخصی تعلق کا بحال ہونا ہے۔ اس امر کے سمجھنے سے یہ غلطی فوراً دور ہو جائیگی کہ کفارہ محض دکھ کے اٹھانے پر مبنی ہے یا کہ ایک قسم کا تبادلہ ہے۔ امر دوم یہ ہے کہ نجات دہندہ کے شخصی افعال کی وقعت اور قدر کا لحاظ کرنے میں ہم اُن شخصی خیالات اور افعال کو نظرانداز نہ کریں جو ہم سے سرزد ہونگے۔ چنانچہ یوحنا رسول نے کہا ہے کہ "اگر ہم نور میں چلیں جس طرح وہ نور میں ہے تو ہم ایک دوسرے کے ساتھ شراکت رکھتے ہیں اور اُس کے بیٹے یسوع مسیح کا لہو ہم کو سارے گناہ سے پاک کرتا ہے" "اگر کہیں کہ ہم بے گناہ ہیں تو ہم اپنے تئیں فریب دیتے ہیں اور سچائی ہم میں نہیں۔ اگر ہم اپنے گناہوں کا اقرار کریں تو ہمارے گناہوں کے معاف کرنے اور ہمیں ساری ناراستی سے پاک کرنے میں وفادار اور راست ہے۔" پولوس رسول بھی صاف صاف یہی بتاتا ہے کہ جتنے ہم میں سے مسیح کو قبول کرتے ہیں وہ مسیح کی موت میں شریک ہونے۔ اُس کے دکھوں میں حصہ لینے اور اُس کے جی اُٹھنے میں شریک ہیں۔ چنانچہ بپتسمہ اسی امر کا نشان اور وسیلہ ہے "کیا تم نہیں جانتے کہ ہم میں سے جتنوں نے مسیح یسوع کا بپتسمہ پایا اُس کی موت کا بپتسمہ پایا۔ پس موت کے بپتسمہ کے سبب اُس کے ساتھ گاڑے گئے" "تاکہ جیسے مسیح مُردوں میں سے باپ کے جلال کے وسیلے سے اُٹھایا گیا ویسے ہی ہم بھی نئی زندگی میں قدم ماریں" (رومیوں ۶: ۳و۴)۔ رسول کے خیال میں یہ نہیں ہو سکتا بلکہ وہ اسے غلط سمجھتا ہے کہ کوئی آدمی مسیح کی موت کے ذریعہ گناہ کے نتائج سے نجات پانے کا دعوے کرے لیکن مسیح کے ساتھ اُس

کی یگانگت اور اتحاد نہ ہو۔ جب مسیح کا اتحاد مسیحیوں کے ساتھ ایسا ہو جاتا ہے کہ مسیح کی روح اور ذات مسیحی شخص میں سرایت کرنے لگ جاتی ہے تب کفارہ کی تعلیم کچھ سمجھ میں آتی ہے اور ہم یہ مانتے ہیں کہ وہ اپنی الٰہی ذات کے وسیلے اپنے ساتھ ہمیں اوروں کی نسبت زیادہ گہرے طور سے ملا لیتا ہے اور یوں اپنی روح ہم میں ڈال کر اپنی مزاج وطبیعت میں شریک کر لیتا ہے۔"

پس ہم اس قسم کے اعتراضوں کو یک لخت الگ کریں جن کا منشاء یہ ہے کہ سزا چونکہ گناہ کا نتیجہ ہے اس لئے ضرور گنہگار کو اٹھانی پڑے گی۔ لیکن جب معترض یہ کہتے ہیں کہ گنہگار کے سوا کوئی دوسرا اُس سزا کو اٹھا نہیں سکتا تو وہ زندگی کے خاص امر واقعی کی تکذیب کرتے ہیں۔ یہ تجربہ کی بات ہے کہ اکثر معصوموں نے دوسروں کے گناہ کے نتائج اٹھائے ہیں اور ایسے نتائج بھی سزا ہیں جیسا کہ ظاہر کیا جائیگا۔

لیکن یہ مسیحی تعلیم کا جزو نہیں کہ مسیحی شخص اپنے گناہ کی سزا نہیں اُٹھاتا۔ البتہ وہ مجموعی نتائج جو خطاکار پر نازل ہوتے اگر کوئی مداخلت خدا کی طرف سے نہ ہوتی دفع ہو گئے ہیں اور اس تعلیم میں ایسی برکت کا وعدہ ہے۔ لیکن یہ تو صاف ذکر ہے کہ خطاکار کو اپنی خطا کا نتیجہ اُٹھانا پڑے گا اور کبھی کبھی یہ نتیجہ بہت سخت ہوتا ہے۔ رسول نے اس سزا کو پُرانے آدم کی موت بتایا ہے یعنے عمر بھر اپنی جسمانی خواہشوں کو مارتے رہنا۔ آخر کار خطاکار اس سے مخلصی حاصل کرتا ہے لیکن بلا توبہ نہیں۔ یہ توبہ روح کا پچھتانا اور پُر درد کشمکش اس کے گناہ کے مطابق ہے۔ اب میں پھر اس بات کو یاد دلاتا ہوں جس کا پچھلے لیکچر میں ذکر ہوا تھا کہ مسیحی دین عالموں کی لاف اور مبالغہ آمیز تعلیموں کا ذمہ وار نہیں۔ مخفی نہ رہے کہ نئے عہد نامہ کی جن کتابوں میں کفارہ کا ذکر

آتا ہے اگن میں [illegible] گناہ سے توبہ کرنے اور خدا کے پاس پھرنے کا بہت ہی [illegible] اور ایسا کسی دوسری کتاب میں نہیں - اس اعلان کے ذریعہ کہ مسیح نے ہمارے لئے کفارہ دیا توبہ کی صفت کو زیادہ ترقی ہوتی ہے ٭

جس قدر شخصی توبہ ترقی کرتی ہے اُسی قدر کفارہ کی ضرورت کی دلیل زیادہ سمجھ میں آتی ہے بعض شاید یہ کہیں گے کہ ایسی توبہ اور اصلاح روش ہی ہماری خطاؤں کے لئے کافی کفارہ ہے کسی دوسرے کفارہ کی ضرورت نہیں - اگر ایسے شخصوں کی تمیز یا کانشنس زیادہ روشن ہو جائے تو وہ دیکھکر حیران ہو جائینگے کہ جو بدی اُن سے سرزد ہوتی ہے × × × × × × اور جو نقصان اُنہوں نے کیا ہے اِس کے مقابلہ میں ان کی تلافی کیسی ادنیٰ ہے - اور یاد رہے کہ بعض ایسی خطائیں ہیں کہ ان کی تلافی ہو ہی نہیں سکتی - اگر کسی نے روپیہ چرایا ہو تو وہ واپس کر سکتا ہے لیکن اگر کسی نے دوسرے کی عصمت اور عفت کو بٹا لگایا ہے - کسی کے دلی اطمینان کو خراب کیا ہے تو کس طرح سے تلافی ہو سکتی ہے ؟ پھر دیکھو بدکلے بدشہوے بد افعال جن سے سرزد ہوتے ہیں اُن کی بری تاثیر کہاں تک پہنچ جاتی ہے - اگر ان بد نتائج کا ایک کرشمہ بھی نظر آ جائے تو ہم کانپ اُٹھیں گے اور معلوم کرینگے کہ ہم ان کی تلافی نہیں کر سکتے - اور جس قدر بدی سارے جہان میں پھیل رہی ہے اور جو برے نتائج اُس سے پیدا ہو رہے ہیں کون انسان اس کا کافی کفارہ دے سکتا ہے پس جب انسان نے یہ مشاہدہ کیا تب کفارہ بخش قربانیوں کا دستور شروع ہوا یہ قربانیاں عالموں کی ایجادیں ہوئی نہیں بلکہ انسان کی تمیز کا نتیجہ ہے ٭

اب یہ سوال رہا کہ کس طرح یہ ممکن ہے کہ کوئی دوسرا ہمارے لئے کفارہ دے - جو توبہ خود ہم پورے طور سے نہیں کر سکتے کس طرح کوئی دوسرا

ہمارے لئے اس کام کو پورا کر سکتا ہے - لیکن اگر تجربہ کا لحاظ کیا جائے تو شاید یہ سوال ہوگا کہ بادوسرے کی مداخلت کے کس طرح ہماری بدی کا کفارہ ہو سکتا ہے - آجکل کی تہذیب کا رُخ اس طرف ہے کہ ہر شخص ایک فرد ہے اور وہ کسی دوسرے پر منحصر نہیں - لیکن مقدس نوشتے ایسا نہیں سکھاتے ملکی قانون بھی اس کی تائید نہیں کرتا بلکہ انسان ایک دوسرے سے وابستہ اور ایک دوسرے پر منحصر سمجھے جاتے ہیں - ان کی سیرت ان کی خوبیاں ان کی بدیاں باہمی تعلقات کا نتیجہ ہیں - شاید کوئی مثال نہ ملے گی خواہ نیکی کی یا بدی کی جس میں کوئی شخص محض فرد غیر منحصر پایا جائے ہم جو کچھ ہیں والدین اولاد یا دوست باہمی اتحاد سے ہیں - بے شک آدمی کی اپنی ذمہ واری ہے لیکن دوسرے بھی اس کے لئے ذمہ وار ہیں اور اگر ہم ہر ایک کی ذمہ واری کو ٹھیک ٹھیک مدنظر رکھیں تو ہم جان لیں گے کہ ہم میں سے ہر ایک کل کا ایک جزو ہے - روزمرہ ہم کو اسی اصول پر چلنا پڑتا ہے - ملکوں اور جماعتوں کو ہم وہاں کے باشندوں اور ممبروں کے لئے ذمہ وار سمجھتے ہیں ٭

اور جب ایک ممبر نے قصور کیا ہے تب ہم ساری جماعت یا ملک سے تلافی طلب کرتے ہیں - ؎

چو از قومے یکے بے دانشی کرد
نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را

ممکن ہے کہ ایسا انتظام ناقص ہو لیکن پھر بھی ایک صداقت پر مبنی ہے - وہ انتظام مصنوعی نہیں کیونکہ کسی نہ کسی حد تک سب کا اس ایک شخص کے فعل میں حصہ ہے اس لئے وہ سب اس کے لئے ذمہ وار ہیں - ویسا ہی اگر کسی جماعت اور ملک نے بحیثیت مجموعی خطا کی ہے تو جس شخص

سے خطا نہیں بھی کی وہ اس جماعت یا ملک کا ممبر ہونے کے لحاظ سے اس خطا میں شریک اور سب کے لئے ذمہ دار ہے ۔

اب اس اصول کو ہم کل نوع انسان پر عائد کریں ۔ تب اس تصور کی حقیقت معلوم ہو جائے گی جس میں مسیح نوع انسان کا سر مانا گیا ہے اس سے اس کی خوبیاں ہم سے منسوب کی گئی ہیں پس اس کفارہ کے کام میں پہلا قدم یہی ہے کہ وہ ہمارے ساتھ ایک ہو گیا ہے یعنی ہمارے گوشت اور لہو میں وہ شریک ہوا ۔ جب صورت حال یہ ہے تو وہ ہماری بدی کے نتائج میں بھی شریک ہے جیسے ہم اس کی روح اور خوبیوں میں ۔ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے ۔ اگر کسی خاندان میں اچھے اور برے ممبر ہوں تو جہاں تک ان کا تعلق ہے وہ ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہو سکتے بد ممبر تو نیک ممبروں کی خوبیوں میں پناہ لیتے ہیں اور نیک ممبر بدوں کی شرارت کے باعث دکھ اٹھاتے ہیں اگر روزمرہ کا تجربہ یہ ثابت کرتا ہے کہ ع بنی آدم اعضائے یک دیگر اند ۔ تو مقدس نوشتوں کی تعلیم اور مسیحی عالموں کی تعلیم جلد سمجھ میں آ جائے گی ۔ فرض کرو کہ ایک شریر خاندان میں ایک کامل نیک شخص ہے ۔ اس کو باقی ممبروں کی شرارت کے باعث سخت افسوس اور رنج ہوگا اور ہر طرح سے کوشش کرے گا کہ جو نقصان دوسروں کی شرارت سے ہو گیا ہے ۔ اس کی حتی الامکان تلافی کرے اور ساتھ ہی اپنی تعلیم تاثیر اور نمونہ کے ذریعہ ان کی اصلاح کی کوشش بھی کرے گا ۔ فرض کرو کہ ایک دوسرا شخص ہے جس کا نقصان اس خاندان نے کیا ہے کیا یہ طبعی انصاف کے مطابق نہ ہوگا کہ تیسرا شخص اس دوسرے شخص کے غم افسوس اور تلافی کو کفارہ

سمجھ کر قبول کرے ۔ اگر ممکن ہو تو اس سارے خاندان کو اس شخص کی خاطر معاف کر دے ؟ البتہ اگر یہ دوسرا شخص اپنے بھائیوں کو توبہ اور انصاف کی طرف آخرکار نہ پھیر سکے تو اس کی پہلی کوشش رائگاں ہوگی ۔ لیکن یہ ممکن ہے اور مسیحی دین بھی یہی سکھاتا ہے ۔

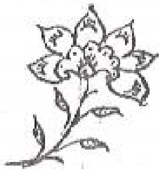
یہ بالکل سچ ہے کہ مسیح شخصی طور پر ہمارے لئے اور ہمارے درمیان کام کرتا ہے اور اس نے جو کچھ کیا ہے اس پر اس کے کفارہ کی تاثیر موقوف ہے ۔ اگر کوئی گناہ کرے تو یسوع مسیح جو صادق ہے باپ کے پاس ہمارا شفیع ہے اور وہ ہمارے گناہوں کا کفارہ ہے ۔ یوحنا رسول یہ نہیں کہتا کہ وہ ہمارے گناہوں کے لئے کفارہ دیتا ہے بلکہ وہ خود اپنی کامل ذات میں کفارہ ہے ۔ ہمارا کل خاندان اس سے ایسا ملحق ہو گیا ہے کہ جدا ہو نہیں سکتا ۔ اور چونکہ اس نے اپنی مرضی سے اپنے تئیں کفارہ دیا ہے اب وہ منظور نہیں کرتا کہ ہماری عدالت اس سے جدا ہو اور ہم اس سے علیحدہ کیے جائیں ۔ اس معنے میں ہم یہ کہتے ہیں کہ اس نے شریعت کو ہمارے لئے پورا کیا اور ہمارے گناہوں کو اٹھا لیا ہے ۔ جیسا میں نے پہلے بیان کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب ہم شریعت کے پورا کرنے سے آزاد ہیں بلکہ خدا کی نظر میں جو ہم سب کو ایک فرد کے طور پر دیکھتا ہے مسیح کی کامل فرماں برداری ہماری ذات کو راستباز ٹھہراتی ہے اور وہ ہماری طرف سے گویا بیعانہ کے طور پر ہمارے گناہوں کے لئے توبہ پیش کرتا ہے ۔ بیعانہ اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ توبہ مسیح کی تاثیر سے ہمارے اندر پیدا ہوگی ۔ صلیب کی خوبی محض دکھ اٹھانے میں نہیں ہے بلکہ یہ امر کہ مسیح نے انسان کی بدی کے پیالہ کی تلچھٹ تک پی لی اور خدا کے سامنے وہ غم اور افسوس

ظاہر کیا جو کہ ایسی بدی سے واسطہ کرنا چاہیئے تھا۔ مجملاً ہم قوانین فطرت کی
جگہ اشخاص کو لے لیں اُن طوفانوں کو خیال کریں جو الٰہی ذات میں غضب اور
عدالت سے رحمت اور محبت سے مشابہ ہیں فرض کرو کہ نوع انسان کی بدی کے
باعث یہ طوفان برپا [illegible] ہے ہیں۔ فرض کرو کہ موسیٰ کی مانند مسیح کھڑا ہو کر یہ دُعا
مانگے۔ [illegible] کو معاف کر دے ورنہ میں تیری منت کرتا ہوں اُس
کتاب میں سے جو تو نے لکھی ہے میرا نام مٹا دے" یہ دلی خواہش کا اظہار
ہوگا ۔

جب مسیح کا خون بہائے جانے اور اُس کے کفارہ کی تاثیر کا ذکر ہوتا ہے
تو مسیح کی قربانی کے اُس روحانی پہلو کو برابر یاد رکھیں کہ اُس کے کفارہ کی
اعلیٰ قیمت اس امر پر موقوف ہے کہ اُس نے اپنے تئیں خود بخود ہمارے
لئے خدا کی مرضی کے سامنے روحانی قربانی گزرانا اس قربانی کا کمال اس طرح
ہوا کہ اُس نے اپنا خون تک بہا دیا اور اپنے بدن کو نذر گزرانا۔ لکھا ہے کہ
ضرور تھا کہ نجات کے پیشوا کو دُکھوں سے کامل کرے اور یہ بھی لکھا ہے کہ
"لہو جان ہے" نہ صرف بدن کی جان بلکہ نفس کی جان بھی۔ یہی جان صلیب
پر بہائی گئی اور گزرانی گئی۔ آخری نزع کی حالت بھی ضرور تھی تاکہ اُس مقدس
شخص کی قربانی کا پورا ثبوت مل جائے اور وہ غم اور محبت اس سے ظاہر ہو کہ
"تیرے ہاتھوں میں اے باپ میں اپنی رُوح سونپتا ہوں۔" مسیح کا لہو جو
رضامندی اور صبر سے بہایا گیا وہ آسمان اور زمین کے سامنے اس بات کا
نشان۔ درحقیقت تھا کہ رُوح کا یہ سونپا جانا پورا اور کامل تھا۔ اس سے خدا کے
سامنے ایک پورا کفارہ دیا گیا اور ساتھ ہی اس کے ذریعے ابن خدا کا فرض
انسان پر پورے طور سے قائم ہو گیا۔ قدیم مفسروں نے جیسا ذکر کیا ہے

یہ ایک وجہ ہے جس کے باعث یہ کہا جاتا ہے کہ مسیح کا خون ہم کو سارے
گناہ سے صاف کرتا ہے خواہ وہ موروثی ہو یا فعلی۔ اس سے نہ صرف پہلے
گناہوں کی قصور واری جاتی رہتی ہے بلکہ بیماری اور مرض کی گناہ آلودہ رغبتیں
بھی دور ہو جاتی ہیں دل بدل جاتا ہے راستبازی کی محبت اور نیکی کی خواہش
پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے تمیز بھی مُردہ کاموں سے صاف ہو جاتی ہے تاکہ
اُس زندہ خدا کی عبادت کرے جس کے سامنے مسیح نے اپنے بدن اور رُوح
کو پورے طور سے نذر کر دیا ۔

ہم نے شروع لیکچر میں بتایا تھا کہ مسیح اپنے دُکھوں میں خدا کو ہمارے
سامنے پیش کرتا ہے آخر میں ہم نے یہ بتایا ہے۔ وہ ہم کو خدا کے سامنے
پیش کرتا۔ یوں اُس کی وساطت سے خدا اور انسان کا باہمی اتحاد ہو گیا
ہے۔ اوّل جو کچھ ہمیں کرنا اور محسوس کرنا چاہیئے اُس نے کیا اور محسوس کیا۔
دوم وہ ہمیں قدرت بخشتا ہے کہ ہم اس کی مانند بنتے جائیں جیسے بدی
ایک شخص سے دوسرے تک پہنچتی ہے ویسے ہی نیکی بھی۔ اور مسیح کی الٰہی
اور انسانی شخصیت کے باعث ہمارے اور خدا کے درمیان اتحاد ممکن
ہو گیا جس کے باعث نوع انسان کو نئی اُمید اور نئی زندگی ملتی ہے۔
جس طریقہ سے یہ اتحاد ہوا اُس کا ذکر مابعد دو لیکچروں میں ہوگا ۔



ساتواں لیکچر

راستباز ٹھہرنے کے معنی

"پس جبکہ ہم ایمان کے سبب راستباز ٹھہرے تو ہم میں اور خدا میں ہمارے خداوند یسوع مسیح کے وسیلے میل ہوا" (رومیوں ۵:۱)

جو مذہب مسیحی دین کی طرح کل فطرت انسان کے لئے مخلصی کے وسائل پیش کرے تو اُسے یہ بھی بتانا ضرور ہوگا کہ کس طرح سے وہ مخلصی مؤثر ہوگی۔ ایسا مذہب امتیاز کر کام میں لائیگا اعدا انسان کی رُوح کے مختلف اعمال رشتوں اور تقاضوں کا لحاظ کریگا اور بتائیگا کہ کس طرح سے یہ مذہب بالتفصیل ان پر اثر کرتا ہے۔ ان امور کو نظرانداز کرکے بعضوں نے مسیحی تعلیم پر اعتراض کئے ہیں اور بہتوں کے دلوں میں اس تعلیم سے تشویش پیدا ہوگئی اور انہوں نے کہا کہ یہ تو محض خیالی باتیں ہیں اور ان کے بارے میں بے فائدہ لوگوں کو تکلیف دی جاتی ہے۔ اس لئے میں ان دو اصطلاحوں کی تشریح کرونگا تاکہ یہ مشکل رفع ہو جائے ۔

ان باتوں کو سمجھنے کے لئے بہت غور اور فکر درکار ہوگا۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ جب تک کوئی شخص عقلی تربیت حاصل نہ کرے وہ مسیحی دین کے فوائد حاصل نہیں کرسکتا۔ یہ صورت بہت کچھ ہماری بدنی حالت سے مشابہ ہے۔ ممکن ہے کہ ایک شخص بالکل تندرست ہو اور ہوا روشنی غذا

سے پورا فائدہ اُٹھاتا ہو تو بھی اپنے بدن کی ساخت وغیرہ سے بالکل ناواقف ہو۔ لیکن اگر صحت کے قوانین کو معلوم کرنا ہو یا ایسے وسائل دریافت کرنے ہوں جن سے بیمار شخص کو صحت حاصل ہو تو طب کا علم درکار ہے اور جماعت کی صحت عام کے لئے ایسے علم کی اشاعت ضرور ہوگی یہی حال دین کا ہے۔ کوئی مسیحی عالم اس بات کا انکار نہ کرے گا کہ سادہ ایمان نجات کے لئے ضرور ہے۔ جیسے صحت کے لئے زندگی کے سیدھے سادے قوانین کافی ہوتے ہیں ویسے ہی دین میں بھی۔ اور سچ مچ وہ لوگ خوش قسمت ہیں جن کو ان سے زیادہ کی ضرورت نہیں اور بہت لوگ بڑے امن چین اور ایمان کی حالت میں انتقال کر گئے ہیں جو خدا پر ایمان رکھتے اور مسیح کو پیار کرتے تھے اور اُس ایمان کی تاثیر سے مسیحی خوبیوں میں ترقی کر گئے یہ گویا روحانی طبقہ کی چوپائی زندگی ہے جن پر شک کے بادلوں نے سایہ نہیں ڈالا نہ آزمائش کے طوفانوں نے انہیں گھبرایا ہے۔ لیکن رُوح کی صحت جو دوسرے لفظوں میں نجات کہلاتی ہے ایسی آسانی سے قائم نہیں رہتی اور جب ایک دفعہ یہ جاتی رہی تو اس کو بحال کرنے کے لئے کم سے کم ویسا ہی وسیع علم درکار ہوگا جیسے بدن کی صحت کی بحالی کے لئے علم طب۔ دین میں سادگی کی خواہش ایک طرح کی شاعرانہ خواہش ہے جو سادہ اور دہقانی زندگی کی خوبصورتی اور خوبیوں کا گیت گاتے رہتے ہیں پھر بھی انسان ایسی سادہ مطمئن زندگی بسر نہیں کرسکتا اگرچہ وہ نہیں چاہتا کہ مطمئن زندگی کے عوض زندگی کے جنگ و جدل اور تجربہ کو اختیار کرے مگر اس سے کچھ چارہ نہیں ۔

اگر ہم یہ سمجھیں کہ رُوح کی ساخت کم سے کم بدن کی طرح پیچیدہ اور

نازک ہے تو ہم اس کے قوانین اور قسمتوں کے مفصّل نشو و نما کو ردّ کرنے کا خیال بھی نہ کرینگے۔ ذی عقل انسان کے لئے جسے دل اور تمیز (کانشنس) حاصل ہے۔ نادانستہ روحانی زندگی بسر کرنا شایاں نہیں۔ اگر ہم روحانی زندگی کی طرف سے آنکھ بالکل بند کرلیں اور اپنی بدنی اور عقلی قوا کی ترقی ہی کا لحاظ کریں تب تو روحانی قوانین وغیرہ سے قطع نظر کرنا قرین قیاس ہوگا۔ لیکن جیسا کہ انسان کا تجربہ ہوا ہے اگر ہماری سب سے بڑی اغراض ہماری روحوں اور روحانی جہان کے درمیان رشتہ پر موقوف ہیں تو ایسی قطع نظر بالکل غیر معقول اور محض نادانی ہوگی۔ اس لئے اِن اصطلاحوں کی تشریح نہایت مفید اور ضرور ہے۔ دیگر علوم کی طرح اس علم میں بھی یہ درکار ہے کہ اس علم کے نتائج صاف اور قابل فہم ہوں۔ دیگر علوم کی طرح اس علم میں بھی قوانین اور اصطلاحیں ہیں جن کو صرف وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو صبر سے تلاش کرتا ہے کہ ان سے کیا مراد ہے ✤

اگر میں نیچرل سائنس پر لیکچر دیتا تو ضرور مجھے ایسی اصطلاحیں استعمال کرنی پڑتیں جیسے کشش ثقل وغیرہ ...... اور حقیقت کو معلوم کرنے کے لئے ان اصطلاحوں کو سمجھنا ضرور ہوتا۔ یہ اصطلاحیں امور واقعی کے مختصر نام ہیں اور تجربہ کے نتائج سمجھنے میں یہ نام مدد دیتے ہیں۔ یہی حال اُن دینی اصطلاحوں کا ہے جیسے راستباز ٹھیرنا۔ پاکیزہ بننا۔ اِن دو ناموں سے بھی تجربہ کے نتائج سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مثلاً راستباز ٹھیرنا روحانی زندگی سے ویسا ہی تعلق رکھتا ہے جیسا کشش ثقل طبعی زندگی سے۔ بے شک بہت معمولی مقاصد کے لئے اتنا جاننا کافی ہے کہ اشیا زمین پر گرتی ہیں لیکن کیا اس وجہ سے ہم اس زیادہ صحیح اور علمی بیان سے پہلو تہی کریں کہ مادہ کا ہر جزو دیگر اجزا

کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور یہ کشش اُسی نسبت سے ہوتی ہے جس نسبت سے اُن کی جسامت ان کے فاصلوں کے مربع پر تقسیم ہو کر۔ ایسا ہی عموماً یہ کہنا غالباً کافی ہوگا کہ آدمی ایمان اور سچائی کے ذریعے نجات حاصل کرتا ہے۔ لیکن کیا اس وجہ سے ہم اس زیادہ مکمل مکاشفہ کو نظر انداز کریں کہ "ہم خدا کے سامنے ایمان کے وسیلے صرف اپنے خداوند اور منجی یسوع مسیح کے باعث راستباز ٹھیرتے ہیں نہ اپنے اعمال کے سبب سے"۔ طبعی اور دینی امور میں سادہ بیانات بہتوں کے لئے کافی ہیں ویسا ہی یہ بھی معقول ہے کہ جوں جوں انسان ترقی کرتا جائے وہ اس سچائی کو زیادہ زیادہ دریافت کرتا جائے۔ کشش ثقل کے قانون کے ذریعے ہماری طبعی قوتیں بہت بڑھ گئی ہیں اور ہماری طبعی زندگی بہت اعلیٰ ہوگئی ہے۔ ویسا ہی مسیحی تعلیم میں ترقی کرنے کے ذریعہ ہماری روحانی تمیز زیادہ تیز ہوجاتی ہے اور ہماری اخلاقی اور روحانی سیرت زیادہ اعلےٰ ہوجاتی ہے۔ لوگوں نے جتنا زیادہ انجیل کی تعلیم کو دریافت کیا ہے اور اس پر عمل کیا اُتنا ہی زیادہ اُنہوں نے رُوحانی خوبیوں میں ترقی کی ہے اور اگر ہم بھی انہیں مقدس لوگوں کا تجربہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اُسی مکاشفہ کو جاننا چاہئے جس نے ان مقدسوں کو منور کردیا ✤

گزشتہ لیکچروں سے زیر بحث مسائل کے سمجھنے میں مدد ملے گی۔ شروع ہی میں شاید یہ بتادینا فضول نہ ہوگا کہ ان دو اصطلاحوں (راستباز ٹھیرنا اور پاکیزہ بننا) کے معنی جدا جدا ہیں۔ بعضوں نے لفظ نجات۔ راستباز ٹھیرنا۔ پاکیزہ بننا کو بلا امتیاز ایسے طور سے استعمال کیا ہے کہ مضمون کو سمجھنا ہی مشکل ہوگیا ہے۔ جنہوں نے میرے بیان پر غور کیا ہے اُن کو یہ سمجھنا مشکل نہ ہوگا کہ ان سے کیا کیا مراد ہے۔ مخفی نہ رہے کہ نجات کے یہی معنی نہیں

کہ وہ فتوئی سے کوئی عجیب آئندہ مخلصی ہے بلکہ اُس سے مراد رُوح کی بحالی ہے۔ یہ بحالی اب شروع ہو جاتی ہے اور بعدہٗ کامل ہو جائے گی۔ یعنی رُوح کے صحیح رشتوں اور کامل صحت کی بحالی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ رُوح کو بیماری لگ گئی ہے۔ اور کوئی ضرورت نہیں کہ کوئی آسمان سے آ کر ہم کو بتا دے کہ بیشمار مرد و عورت ایسے ہیں جن کے لئے یہ بیماری طبعی طور پر لا علاج ہو گئی ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہماری کل ہستی فنا ہو جائیگی۔ انسان کی تمیز نے منوّر ہو کر اس بات کی شہادت دی ہے کہ بڑے بڑے لوگوں میں بھی یہ خرابی یہ بیماری پائی جاتی ہے۔ مسیحی دین کا یہ دعوےٰ ہے کہ اس مُہلک بیماری کا علاج کرے اور راستباز ٹھیرنا اور پاکیزہ بننا اس علاج کے استعمال کے طریقے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ انجیل کی روشنی کہاں تک ہماری روحانی ہستی کے حالات پر پڑتی ہے اور کہاں تک آئندہ جہان کا خیال ہم میں پیدا کرتی ہے۔ اور یہ بھی ہم نے معلوم کر لیا کہ رُوح کی صحت کلی اُس کے مشخص رشتوں کی صحت پر مشتمل ہے۔ آدمی کو ایسا علیحدہ اور تنہا نہیں کر سکتے جیسے پودے اور حیوان کو علیحدہ علیحدہ کر کے اُن کے حالات پر غور کر سکتے ہیں بلکہ انسان کے بارے میں یہ دریافت کرنا ہوتا ہے کہ اُس کا دوسروں کے ساتھ کیا رشتہ ہے اور مسیحی دین اس شخصی رشتہ کو خدا تک وسیع کر دیتا ہے۔ خواہ الٰہی شخصیت کے کچھ ہی معنی ہوں ہم اُس سے بہر حال شخصی رشتہ رکھتے ہیں اور اگر یہ درست ہے تو ہماری ذات کی نجات اسی رشتہ کے درست و سالم ہونے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ بیان ہو چکا ہے کہ ہم اپنے ہمجنسوں کے ساتھ رشتہ میں قصور واری اور ذمہ واری کے خیال سے بچ نہیں سکتے ویسا ہی خدا کے ساتھ جب

ہمارا اسی قسم کا رشتہ ہوا تو وہاں بھی قصور واری اور ذمہ واری کا خیال پایا جائیگا اور جب نوع انسان کو ہم نے ایک خاندان قرار دیا جو عام بدی اور عام ذمہ واری میں شریک ہیں تو اگر وہ چاہتے ہیں کہ راستباز وجود کی بے حد مہربانی اور محبت اُن پر نازل ہو تو ان کے گناہوں کے لئے کسی نہ کسی کفارہ کا دیا جانا ضرور ہو گا اور کامل پاکیزگی کا چشمہ درکار ہو گا کہ اس عام بدی کی تاثیر کو دور کرے۔ مسیح کا ہماری ذات اختیار کرنا اور ہمارے گناہوں کا اُٹھا لے جانا ہم کو ضروری طاقت بخشیگا اور نوع انسان کی عزت افزود کریگا۔ اور اگر وہ ہم سے علیحدہ ہونا نہیں چاہتا اور وہ خدا کے پاس ہمارا شفیع ہے اور ہمارے گناہوں کا کفارہ ہے تو ہمیں یقین ہے کہ ہم بھی اس الٰہی رفاقت سے خارج نہیں ہو سکتے۔ ابھی تک میں نے اس بات کا تو ذکر نہیں کیا کہ کیوں ہم یسُوع مسیح کو ایسا شخص سمجھتے ہیں اور کیسے ثابت ہے کہ اُس کا ہمارے ساتھ اور خدا کے ساتھ ایسا رشتہ ہے۔ یہ تو میں دوسرے حصہ میں بتاؤنگا۔ اب تک تو میں اسی بات کا ذکر کرتا رہا ہوں کہ یہ پیش کردہ خیالات ہماری تمیز کے تقاضوں کے خلاف نہیں ہیں۔ اب ہم ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ بتائینگے کہ کس طرح یہ نجات بخش تاثیر کام کرتی ہے +

پہلی ضرورت یہ ہے کہ رُوح کو خدا کی رفاقت میں بحال کریں اور یہاں سے وہاں تک سرافراز کریں۔ اور اعلےٰ مقصد یہ ہے کہ ہم خداوند اپنے خدا کو سارے دل و جان عقل اور طاقت سے پیار کریں اور پڑوسی کو اپنے جیسا پیار کریں۔ اس مقصد کا حاصل کرنا ہماری کامل پاکیزگی ہے اور جس طریقہ سے ہم کامل پاکیزہ بنتے ہیں اس کا ذکر اگلے لکچر میں ہو گا۔ اس بحالی کا پہلا درجہ یہ ہے کہ اُس جہالت اور جدائی کی حالت سے جس میں رُوح

تھی شخصی حاصل کرے۔ اس پہلے درجہ کو۔ اس ابتدائی ملاپ کے فعل
کو مقدس پولوس راستباز ٹھہرنا کہتا ہے۔ اس اصطلاح کے لغوی معنی ظاہر
کرینگے کہ کہاں تک انسانی ذات کے تقاضے سے اس کا علاقہ ہے۔ راستباز
ٹھہرنا دلالت کرتا ہے خطا سے رہا ہونے۔ پر خدا کی عدالت خواہ اسی جہان
میں ہو خواہ دوسرے جہان میں ایک ہولناک بات ہے۔ پولوس کے دل
میں بار بار اس عدالت کا خیال موجود تھا اور اس کو مدنظر رکھ کر وہ رومیوں
کو جتاتا ہے کہ انجیل کے ذریعے تم راستباز ٹھہر سکتے ہو۔ میں اس مسیحی تعلیم کے
معنے محدود کرنا نہیں چاہتا یہ لفظ ہماری شخصی خطا اور قصورواری پر دلالت
کرتا ہے اور یہ خطا و قصورواری ہماری رُوح پر ایک طرح کا بوجھ تھا۔ شاعروں
نے کئی دفعہ اس کا ذکر کیا ہے کہ اگر ہمارے دلوں کی حالت ہمارے
ہمجنسوں پر کھل جائے تو ایسی شرم آئیگی کہ کسی کو منہ دکھانا نہ چاہینگے۔
شاعرانہ بیان کی ضرورت بھی نہیں۔ ہمارے دل خود شاہد ہیں کہ جتنا ہم اپنی
بابت جانتے ہیں اگر دوسرے جانتے تو بالکل اور طرح سے ہمارے ساتھ
سلوک کرتے۔ کئی دفعہ یہ حالت گذری ہے کہ اگر ہم اپنے قصور کا پورا پورا
اقرار اور اظہار کرینگے تو ان سے جدا ہو جائیں گے جن کا ہم پر بھروسہ ہے
یا جن پر ہم بھروسہ کرنا چاہتے ہیں۔ محض یہ نہیں کہ ہماری یا اُن کی ذات
کو نقصان پہنچا ہے بلکہ کچھ ایسی بات ہے کہ جو ہم کو جدا کر دیتی ہے اور اعتبار
کو کم کر دیتی ہے۔ مقدس یوحنا نے کہا ہے "اگر ہم نور میں چلیں جیسا وہ نور
میں ہے تو ہم ایک دوسرے کے ساتھ رفاقت رکھتے ہیں"۔ عدم رفاقت
ہمارے خیالات اور افعال میں تاریکی آ جانے کا لازمی نتیجہ ہے۔
اب ہم اس تشریح کو جو ہم نے راستباز ٹھہرنے کی کی ہے خدا کے

رشتے پر صادق لائیں۔ فرض کرو کہ ایک ایسے وجود سے ہمارا رشتہ ہے جس
کے سامنے ہمارا ہر ایک خیال قول اور فعل کھلا ہے جس کی آنکھ ہماری تمیز کو پامال
کر لیتی ہے۔ اگر یہ بات ہم پر کھل جائے تو اس کا کیا نتیجہ ہوگا۔ تجربہ سے کافی
جواب ملتا ہے۔ ہر طبعی دین میں انسانی تمیز نے خوف کا اظہار کیا ہے اور یہ خوف
قصورواری سے پیوستہ ہے۔ جہاں کہیں اعلٰے وجود کا خیال پیدا ہوتا ہے تو
یہ خیال بھی پیدا ہوتا ہے کہ ہم اپنے فرائض ادا کرنے میں قاصر رہے ہیں۔
الٰہی رُوح کے ساتھ جہاں سامنا آ پڑتا ہے وہاں اپنی ناکاملیت کا خیال
خواہ مخواہ پیدا ہو جاتا ہے اور ناکاملیت کا خیال کسی نہ کسی قدر ذمہ واری کو ظاہر
کرتا ہے۔ دینداروں نے اپنے دل کا حال یوں ظاہر کیا ہے "اپنے بدن
کو اپنے ساتھ عدالت میں نہ لا"۔ طبعی دین سے شہادت پیش کرنے کی بھی
ضرورت نہیں مسیحی اُمت کا بہت کچھ یہی تجربہ ہوا ہے۔ مسیحی دین کی خاص
یہ تاثیر ہوتی ہے کہ گناہ اور بدی کی پہچان زیادہ گہری ہو گئی ہے۔ مسیح نے
یہ کہا تھا کہ میں رُوح کو بھیجونگا وہ آ کر جہان کو گناہ کا قائل کرے گا۔ اُس وقت
سے لے کر برابر یہ تاثیر ہو رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسیحی لوگ انجیل کو پورے
طور سے نہ سمجھنے کے باعث اور لوگوں کی نسبت زیادہ بزدل ہو گئے۔ اگر ہم
غور کریں یا یہ ہم پر منکشف ہو جائے کہ ہماری کل رُوح و جان خدا کی آنکھ کے
سامنے کھلی ہے تو فوراً ہم چلا اٹھینگے "اے خداوند مجھ سے دور ہو کیونکہ میں
گنہگار ہوں"۔ جب تک قصورواری کا خیال اور خوف باقی رہتا ہے تب
تک خدا سے صلح اور اُس سے محبت ناممکن ہے اور رفاقت ہو نہیں سکتی
ہم ضروری سزا سے تو بچنا نہیں چاہتے بلکہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارا گناہ
فراموش کر دیا جائے اور اُس کی محبت میں بحال ہو جائیں۔

خدا کے ساتھ جو ہمارا معاملہ ہے اُس کے لحاظ سے قصورواری
اور سزا میں خاص فرق ہے۔ اگرچہ قصورواری کا علم سب سے بڑی سزا ہو
تو بھی ممکن ہے کہ محض سزا تو ہو لیکن قصورواری کو آدمی محسوس نہ کرے
جیسا ہم ذکر کر چکے ہیں اگر ہم خدا کے ساتھ ویسے رشتے کے قائل ہوں تو
قصورواری کی معافی اور اُس معافی کا علم رُوح کی پہلی اور مقدم ضرورت
ہوگی۔ اگر ایسی معافی مل جائے تو آدمی ہر طرح کی سزا اُٹھانے سے معترض
نہ ہوگا۔ لیکن بلا اس معافی کے ہر طرح کی برکت بھی ایک ناقابل برداشت
بوجھ ہوگا۔ جیسا کسی نے کہا ہے۔ دل ایک ایسی جگہ ہے چاہے وہ
دوزخ کا بہشت بنا دے چاہے بہشت کا دوزخ بنا دے۔ جب آدمی
کو علم ہو کہ خدا کے ساتھ اس کا رشتہ ہے اور اس کو یقین ہے کہ خدا نے
اُسے معاف نہیں کر دیا تو اگر اُس کو بہشت میں بھی لے جائیں وہ اس
کے لئے دوزخ ہوگا لیکن اگر اس کو اپنی معافی کا علم ہو اور وہ دوزخ میں
بھیج دیا جائے تو وہ دوزخ اُس کے لئے بہشت ہوگا۔ مسیحی عالموں
کا یہی مقصد ہے کہ اگر ہم اپنی خوشحالی اور کمال چاہتے ہیں تو کامل خدا
کی رفاقت میں رہ اُسے تلاش کریں اور اپنی رُوح کو خدا کی طرف زیادہ زیادہ
لگائیں۔ فرض کرو کہ ہمارے جیسے گنہگار کامل روشنی میں چلیں اور اپنے بچاؤ
کے درمیان کامل اعتبار رکھیں تو آپ سمجھ سکینگے کہ یہ کیسی بڑی برکت
ہوگی کہ ہم خدا پر کامل بھروسہ رکھیں۔ شاید پولوس رسول کا ابتدائی خیال
یہ ہو کہ راستبازی کی تلاش کرے لیکن چونکہ اُسے علم تھا کہ ہمارا شخصی
رشتہ خدا کے ساتھ ہے اس لئے اُس خدا کے ساتھ ملاپ کرنے کی
خاص آرزو اُسے تھی۔ پہلے وہ یہ چاہتا تھا کہ راستبازی کی شریعت پر

چلے لیکن جوں جوں راستباز خدا کا تصور اس کی تمیز میں بڑھتا گیا خدا کے ساتھ
ملاپ حاصل کرنے کا خیال بھی ترقی کرتا گیا۔ اس سے مسیحی زندگی کا تصور
اُس کے دل میں وہی ہے جو یوحنا رسول کا تھا۔ "اگر ہمارا دل ہمیں الزام
دے تو خدا ہمارے دل سے بڑا ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔ اے پیارو
اگر ہمارا دل ہمیں الزام نہ دے تو ہم خدا کے حضور دلیر ہو جاتے ہیں اور جو کچھ
ہم مانگتے ہیں اُس سے پاتے ہیں کیونکہ ہم اُس کے حکموں پر عمل کرتے ہیں
اور جو کچھ اُسے خوش آتا ہے بجا لاتے ہیں"۔ لیکن کون انسان کہہ سکتا ہے کہ
اُس کا دل اُس کو الزام نہیں دیتا۔

اب ذرا سوچیں کہ جب آپس میں کوئی مشکل ہمیں پیش آتی ہے تو
کس طرح اس کو حل کرتے ہیں۔ فرض کرو کہ دو شخصوں کے درمیان رشتہ
اتحاد ٹوٹ گیا ہے اور وہ رشتہ پھر بحال کیا چاہتے ہیں۔ ایسی بحالی کے
لئے معافی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس معافی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قصوروار
کو ہم ایسا سمجھیں کہ گویا اس سے قصور سرزد نہیں ہوا یعنی اُس سے ایسی
سیرت منسوب کرتے ہیں جس کا وہ لفظی طور پر مستحق نہیں۔ جب مسرف
بیٹے نے یہ کہا کہ "میں تیرا بیٹا کہلانے کا مستحق نہیں" تو اس نے سچ کہا اور
جب باپ نے اُس سے ایسا سلوک کیا جس کے وہ لائق نہ تھا تو باپ نے
اُس سے ایسی سیرت منسوب کی جس کا وہ لفظی طور پر حقدار نہ تھا۔ اگر خدا اور
انسان کا رشتہ محض خالق و مخلوق کا رشتہ ہو۔ اگر رُوح انسانی محض قوانین
کا ہی تختہ مشق ہو تو انجیل کا بیان راستباز ٹھیرنے یا راستبازی منسوب ہونے
کا درست نہ ہوگا۔ لیکن اگر خدا کا رشتہ ہم سے ایسا ہے جیسا ایک شخص کا
دوسرے شخص سے ہوتا ہے تب یہ منسوبیت اور مقبولیت کا خیال درست

معلوم ہوگا۔
رشتہ کا یہ اتفاقی جزو نہیں بلکہ ضروری جزو ہے۔ مُسرف بیٹے کی تمثیل سے
اس کی زیادہ تشریح ہو جائیگی۔ باپ اور بیٹے کا جسمانی رشتہ چنداں مدِ نظر
نہیں جو کچھ باپ بیٹے کو دے سکتا تھا اُس کا حظ اُٹھانا اگر وہ ذمہ وار
اشخاص ہیں، اس بات پر موقوف ہوگا کہ بیٹا اخلاقی طور پر باپ سے کیسا
برتاؤ کرتا ہے یہ ممکن ہے کہ کوئی بیٹا ایسے طور سے چلے کہ باپ گو پدرانہ شفقت
دل میں رکھے لیکن مجبوراً اپنے بیٹے سے پدرانہ سلوک نہ کرے۔ فرض کرو ایسی
حالت میں باپ اپنے بیٹے کے پاس جو اُس کے گھر سے چلا گیا ہے یہ پیغام
بھیجے کہ گو تو نے نالائقی کی ہے اور مجھ سے اور اپنے سے نامناسب سلوک
کیا ہے تو بھی میری محبت میں فرق نہیں آیا۔ میں منت کرتا ہوں کہ تو واپس
میرے پاس آجا۔ میں تیرے گزشتہ سلوک کو فراموش کر دونگا اور ایک لفظ
بھی نہیں کہوں گا اور ہر طرح سے اپنے بیٹے کے طور پر سلوک کرونگا۔ میں تجھ
پر ایسی نظر کرونگا کہ تُو میرا حقیقی بیٹا ہے اور شاید تو اپنی پہلی بُری عادتیں اور
بد چلنیاں یک لخت چھوڑ نہ سکے تو بھی میں اپنی نظر تیری طرف سے پھیر نہ
لونگا۔ اگر باپ ایسا کہے تو کوئی اُس پر الزام نہ لگا سکیگا اور بیٹا جان لیگا کہ
ایسی سیرت اُس سے منسوب کی گئی ہے جس کا وہ مستحق نہ تھا لیکن یہی باپ
کی مہربانی کا خاص خاصہ ہے۔ اگر ایسے پیغام سے بیٹے کے دل میں یہ فرزندانہ
حقیقی محبت پیدا ہو جائے اور اُس کو پورا یقین رہے کہ باپ سچ مچ مجھے پیار
کرتا ہے تو وہ باقی ہر بات کی جو اس لئے ضرور ہو خوشی سے برداشت کریگا۔
یہی مُسرف بیٹے کی تمثیل ہے۔ صرف یہ زیادتی اس میں ہے کہ باپ بیٹے کے
پاس پیغام بھیجتا ہے جیسے انجیل میں مذکور ہے کہ خدا باپ اپنے بھٹکے ہوئے

بچوں کے پاس پیغام بھیجتا ہے۔ بیٹا جب باپ کے گھر میں واپس آجاتا ہے
تو بڑی برکت یہ نہیں کہ اُس کے لئے موٹا بچھڑا ذبح کیا جاتا ہے۔ یا عمدہ سے
عمدہ لباس اُسے پہنایا جاتا ہے یا ایک نیا موقع اُسے دیا جاتا ہے تاکہ وہ
اپنے چال چلن کو سدھارے۔ بلکہ یہ بڑی برکت تھی کہ باپ اُس کو دوڑ کے
ملنے جاتا ہے اُسے گلے سے لگا لیتا ہے اُسے چومتا ہے۔ اِس سلوک کے
باعث بیٹے کو یقین ہو گیا کہ اُس کی پوری معافی مل گئی اُس کی سابقہ بدی
فراموش کی گئی اور ایسی سیرت اُس سے منسوب ہوئی جس کا وہ مستحق نہ تھا گو اُس
نے مُسرفانہ زندگی بسر کی تھی تو بھی اب وہ اپنے باپ کے گھر میں بیٹے کے
طور پر رہ سکتا ہے۔ آئندہ زندگی میں ایسی سیرت کا منسوب ہونا ایک بڑا جزو
ہوگا۔ ایسا ہی جو شخص جانتا ہے کہ اُس کا رشتہ خدا سے ہے تو وہ یہ جانتا
ہے کہ اُس کی زندگی کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ خدا اُس کو پورے
طور سے معاف کر کے قبول کرے اور جو شخص اپنی بدکاری سے بخوبی واقف
ہے وہ یہ جانتا ہے کہ ایسی معافی اور مقبولیت کے یہ معنی ہیں کہ اُس سے ایسی
سیرت منسوب کی گئی ہے جس کا وہ مستحق نہ تھا۔ یہ معافی اور قبولیت مع منسوبیت
کے راستباز ٹھیرانا ہے نہ بلحاظ قانون کے بلکہ بلحاظ شخصی رشتہ کے۔

شاید کوئی یہ کہے کہ ایسی منسوبیت بے معنی ہوگی جب تک معاف کنندہ
کو یہ یقین نہ ہو کہ جسے وہ معاف اور قبول کرتا ہے اُس نے سچی توبہ کی ہے
اور آئندہ کے لئے درست چال چلنے کا ارادہ رکھتا ہے یہ سچ ہے۔ اس لئے
اس تعلیم میں دوسرا قدم یہ ہے کہ خدا اسی شرط پر راستباز ٹھیراتا ہے کہ آدمی
یسوع مسیح پر ایمان لائے۔ لفظ ایمان کی تعریف کرنا یہاں ضرور نہیں۔ گو
اس کی تعریف کے بارہ میں کچھ اختلاف ہوا ہو لیکن اس کے معمولی عام معنی

ہر کوئی جانتا ہے۔ اور میں اسی عام معنی میں اس کا استعمال کرونگا۔ اس کے
معنے محض کسی بات کا مان لینا نہیں بلکہ اس کے معنی ہیں کسی شخص پر بھروسہ
رکھنا۔ جس قدر مہربان قادر وہ شخص ہے اُسی قدر مضبوط یہ ایمان ہے۔ پس
یسوع مسیح پر ایمان لانے کے یہ معنی ہونگے کہ انجیل میں جو دعوے اُس نے
کیا ہے اور جس طرح کلیسیا اُسے پیش کرتی ہے کہ وہ ہمارا خداوند اور نجات
دہندہ ہے ویسا ہی ہم مان لیتے اور اپنے تئیں اس کے سپرد کرتے اُس
کی اطاعت اور پیروی کرتے اُس کی مانند ہونے کی کوشش کرتے اور اُس
کی مرضی پر چلتے ہیں۔ روح کی صحت کے بارہ میں جو کچھ کہا گیا ہے اُس کا
لحاظ کر کے فرض کرو کہ جیسا مسیح دعوے کرتا ہے ویسا ہی اس کو مانیں تو یہ
ظاہر ہے کہ ایمان کے ذریعے ہم وہ ضروری قدم اُٹھاتے ہیں۔ جو ایسی صحت
کے لئے درکار ہے وہ ہمیں اپنا جز ٹھہراتا ہے ہمارے لئے جوابدہی کرتا ہے
اور ہمارا وکیل بن جاتا ہے اور ساتھ ہی ہم کو اپنی سیرت اور نمونہ پر بناتا جاتا ہے
جس شخص کا تعلق اور رشتہ مسیح سے ایسا ہو گیا ہے تو خدا اُس پر علیحدہ
خطاکار فرد کی حیثیت سے نظر نہ کریگا۔ ایسے شخص نے مسیح کی محض قدرت اور
رضامندی میں پناہ نہیں لی بلکہ اُس کی روح اور ذات میں۔ اب اُس میں
گویا مثیل مسیح کی ساری صفات موجود ہیں۔ چنانچہ رسول نے ایسے شخص کو
نیا مخلوق کہا ہے۔ پرانی چیزیں گذر گئیں دیکھو سب نیا ہو گیا ہے۔ بدی کے
لئے جو غم اور توبہ مسیح سے صادر ہوئے وہ اب اُس شخص کا غم اور توبہ بن
گئے۔ اور یوں کفارہ انسان کو خدا سے اور خدا کو انسان سے ملا دینے کا وسیلہ
ہو گیا۔ ایمان کے ذریعے انسان کا نیا رشتہ پیدا ہو جاتا ہے اور اس رشتہ کے
ذریعہ اُس شخص کی ذات اور صفات بالکل بدل جاتی ہیں ٭

فرض کرو کہ مسیح کا اور انسان کا ایسا رشتہ ممکن ہے تب راستباز ٹھہرنے
کی تعلیم معہ اس امر کے کہ گنہگار سے نئی سیرت منسوب کی جائے اور اُس
کو مقبولیت مل جائے تو یہ ان رشتوں کے عین مطابق ہوگا جو ہم ایک دوسرے
سے رکھتے ہیں بلکہ اسی تعلیم کے ذریعے وہ نقص بھی رفع ہو جائیگا جو محض معافی
کی تعلیم میں پایا جاتا ہے۔ بعضوں نے یہ سوال کیا کہ کیوں خدا بلا شرط اور مطالبہ
ایمان کے معاف نہیں کر دیتا۔ اس سوال کا جواب اس پر موقوف ہے کہ
معافی کے کیا معنے سمجھے جاتے ہیں۔ اس کے اکثر یہ معنے ہیں کہ خطاکار کو دل
میں وہی جگہ اور اعتبار دیا جائے جو خطا سے پیشتر اُسے حاصل تھا۔ یہ ممکن ہے
کہ اگر کسی نے تمہارا نقصان کر دیا ہو اُس کو تم معاف کر دو۔ لیکن بلا شرط
اُسے اپنے دل میں وہ جگہ نہیں دے سکتے جو اُسے پہلے حاصل تھی۔ ضرور
کچھ ضمانت درکار ہے نہ محض توبہ بلکہ ایسی توبہ کہ وہ غالباً آئندہ کو ایسا نقصان
نہ کریگا۔ پس راستباز ٹھہرنا محض معافی پانا نہیں بلکہ معافی پانا مع مقبولیت
کے اُس کے حاصل ہونے سے پیشتر آئندہ کے لئے ایک طرح کی
ضمانت یا عہد ضرور ہے۔ اور یہ وہی عہد یا ضمانت ہے جس کو رسول
مسیح پر ایمان لانا کہتا ہے جس کے بغیر کوئی راستباز ٹھہر نہیں سکتا ٭

اس سے ظاہر ہے کہ نجات کے لئے یہ شرط اندھا دھند نہیں
ٹھہرائی گئی۔ بلکہ اس شرط کا یہ مطلب ہے کہ انسان حق کو تسلیم کرے۔
اگر مسیح آدمیوں کا رہنما اور نجات دہندہ ہے جس کے ذریعے سے ہم پاک
ہو سکتے ہیں تو یہ صریح امر ہے کہ اُس پر ایمان لائے بغیر نجات نہیں مل
سکتی نہ اس جہان میں نہ اُس جہان میں۔ کسی نہ کسی طرح سے اگر انسان
سچا بننا چاہتا ہے تو سچائی سے اس کا رشتہ ہونا چاہیے اور اگر نجات

پاتا ہے تو سچا بننا چاہئے۔ بعض عالموں نے راستباز ٹھیرنے کے معنی بتائے
ہیں تصدیق کرنا کہ ہماری تمیز مسیح کے اخلاقی دعاوی کی تصدیق کرے اور
مناسب بھروسہ اُس پر رکھے مصلحین نے بار بار اس پر زور دیا کہ ایمان
مسیح کو محض ماننا نہیں بلکہ وہ مسیح کے الفاظ کا جواب ہے جو آدمی کے دل
سے نکلتا ہے۔ اسی لئے اُن مصلحین نے اس پر زور دیا کہ آدمی ایمان ہی
کے وسیلے راستباز ٹھیر سکتا ہے۔ کیونکہ اُس حق اور زندگی کی اطاعت پر
سب کچھ موقوف ہے اور مابعد چلن اسی اطاعت اور ایمان کا نتیجہ ہے۔

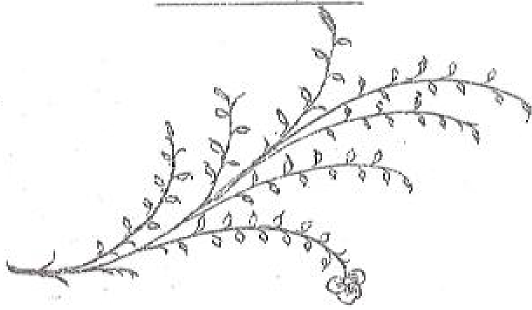
بڑی بھاری غلطی اس تعلیم کے بارے میں یہ ہے کہ اخلاقی توبہ و
اصلاح کی ضرورت لوگ گھٹا دیتے ہیں۔ بلکہ برعکس اس کے یہ تعلیم تو
بتاتی ہے کہ اصلاح نہایت ضروری وسیلہ ہے۔ توبہ ضرور ہے۔ بلکہ
یہ ایسی شرط ہے جس کے وسیلے اصلاح مفید ہو سکتی ہے۔ اگر خدا کی
روحانی نیک ذات نظرانداز کی جائے اگر راستباز ٹھیرنے۔ اور نجات کو
خلط ملط کریں۔ اور اگر نجات کا یہی مطلب لیا جائے کہ وہ ایک آئندہ فتوے
سے مخلصی ہے تب تو ان اعتراضات کی گنجائش ہے۔ لیکن اگر راستباز
ٹھیرنے سے وہی مراد لی جائے جو مقدس پولوس اور مصلحین نے لی کہ یہ
راستبازی۔ کہ خدا اور انسان کے درمیان بھروسہ اور رفاقت کا بحال ہونا
ہے تب تو انسان پر الٰہی مرضی اور قوت کی پوری روحانی تاثیر ہوگی۔
الغرض اس تعلیم کی غرض یہ نہیں کہ جب چاہے انسان اپنے گناہ کی سزا
سے بچ جائے۔ یہ تو غلط ہے بلکہ اس کی یہ غرض ہے کہ پاک اور عادل
خدا اپنی معافی پاکیزگی۔ عدل سچائی ہر شخص کے سامنے پیش کرتا ہے
کہ وہ انہیں اُس کے ہاتھ سے قبول کرے یوں اس کا اتحاد یسوع مسیح

کے ساتھ ہوگا۔ جو ایمان یسوع کا تھا۔ گناہ کے لئے جو دُکھ کا غم تھا۔ انسان
کی سزاؤں کو جو اُس نے صبر سے برداشت کیا تھا ان سب سے ایسے شخص
کا اتحاد ہو جائیگا۔ پس اس تعلیم کا یہ اعلان ہے کہ خدا چونکہ ہر شخص کو پیار کرتا
ہے وہ اس کے گناہوں سے اُس کی بے انصافی سے اُس کی ناپاکی سے
کسی ضروری سزا کے ذریعے اُسے پاک صاف کریگا جو شخص یہ برکت چاہتا
ہے وہ خدا سے مانگے خدا عنایت کرے گا۔ لیکن جو لوگ اخلاقی شرع کے
مخالف ہیں وہ اس سے نہیں مانگینگے۔ زمانہ اصلاح کے وقت جب اس
تعلیم کو فروغ ہوا تو یورپ پر اس کی بڑی تاثیر ہوئی۔ بعض اور کوششیں
بھی اس کے لئے ہو رہی تھیں لیکن جب لوتھر نے خادمانِ دین اور لوگوں
کو اس تعلیم سے بھر دیا تب باقی کوششوں کا پورا نتیجہ حاصل ہوا اور یہ تعجب
کی بات نہیں کہ ایسی تعلیم کا ایسا عجیب نتیجہ ہو۔ کیونکہ اس تعلیم کا مقصد یہی
ہے کہ ہر شخص کا خوف دور کرے اور قصور واری کا وہ کانٹا نکال دے جس
نے ہم کو خیال اور فعل میں بزدل بنا رکھا تھا اور ہم کو عادل قادر مطلق خدا
کی محبت و مہربانی میں بحال کرے۔ یہ پروٹسٹنٹ تعلیم لوتھر کی زبان سے نکلی
جس نے جہان کو نئی زندگی بخشی۔ لوتھر کا یہ اشتہار تھا کہ خدا کا منشا یہ ہے
کہ خدا کے فرزند نڈر مطمئن اور فراخ حوصلہ ہوں اور مطلق کسی بات سے نہ
ڈریں اور خدا کے فضل پر بھروسہ رکھکر ساری چیزوں پر غلبہ حاصل کریں اور
سزا و موت کو کھیل سمجھیں باغیوں کو وہ بزدل سمجھکر حقیر جانتا ہے کہ وہ ہر
شے سے ڈر کر پات پتے کی کھڑکھڑاہٹ سے ڈر کر گھبرا جاتے ہیں یہ تعلیم
محض مصلحین کی ایجاد نہ تھی بلکہ مسیحی دین کے دو بڑے اصولوں کی اشاعتِ
ثانی تھی وہ اصول یہ ہیں (۱) کہ کامل راستباز اور قادر شخص خدا کے ساتھ

انسان کا رشتہ ہو (۲) کہ اس رشتہ کو کامل بھروسہ اطمینان اور بے باکانہ قبول کریں صرف اس شرط پر کہ یسوع مسیح کی مرضی اور روح کے تابع پورے طور سے ہو جائیں۔

اسی لیے تو تفرنے اس مسئلہ کو کلیسیا کے کھڑے ہونے یا گرنے کا مسئلہ کہا ہے۔ جس ملک میں ایک دفعہ مسیحی دین کا نور چمک چکا ہے اس ملک میں شائستگی کے کھڑا ہونے اور گرنے کا بھی مسئلہ ہے ایسے ملک میں راستباز قادر مطلق خدا کا خیال مٹ نہیں سکتا۔ اگر اس خیال کے ساتھ کہ خدا عادل منصف ہے یہ خیال بھی نہ رہے کہ وہ خدا مخلصی دینے والا ہے جب تک یہ نہ سمجھا جائے کہ خدا محض راستبازی طلب کرنے والا نہیں بلکہ راستبازی بخشنے والا بھی ہے تب تک ہر طرح کی غلط تعلیم اور وسواس کی بہت گنجائش ہے نادیدہ جہان کے خیالات اور اندیشوں کو محض خیالی بلا نہیں سمجھنا چاہیے۔ ان خیالات اور اندیشوں کا علاج اُس نجات دہندہ پر ایمان لانے کے وسیلے سے ہوتا ہے جس نے ان پر فتح حاصل کی ہے اور اگر ہم اُس کا حکم مانیں تو وہ ہمیں اُن سے مخلصی دے گا۔ اصلاح کے وقت سے لے کر یہ خاص آزادی اور بہت بڑا بر اس تعلیم کے ذریعے سے بڑھتی گئی ہے۔ جہاں اس تعلیم کو بہت صاف طور پر لوگوں نے سمجھا نہیں وہاں بھی اس کی تاثیر یہ ہوئی ہے کہ خدا پر اور اُس کے قوانین پر زیادہ بھروسہ کیا جاتا ہے۔ اور سچائی کی تلاش میں ہر طرح کی تکلیف گوارا کی جاتی ہے۔ ناشائستہ خوف کے ذریعے جتنی بے عزتی خدا کی ہوتی ہے اتنی نامناسب بھروسے سے نہیں ہوتی۔ لیکن جب بھروسہ کی بنیاد غلط ہے یا ناقص بنیاد ہے اس کے جاتے رہنے کا اکثر اندیشہ ہوتا ہے۔

مردانہ بہادری۔ بھروسہ اور سچائی کی محبت کے لئے راستباز ٹھیرانے والے اور نجات بخشنے والے خدا پر زندہ بھروسہ رکھنا ایک مستقل اور عالمگیر وسیلہ ہے۔ لیکن جو ایمان ایک خاص عقیدے پر مبنی ہے وہی یقینی ہے۔ اور جو ایمان مسیح کی زندگی موت اور قیامت کے سبب سے زندہ ہو جائے وہ ہر طرح کی آزمائشوں پر غالب آ سکتا ہے۔ جب تک حامیانِ دین اس تعلیم کو اُلٹ نہ دیں وہ آزادی کے دشمن نہیں ٹھیر سکتے بلکہ خدا نے اُن کے سپرد یہ انجیل کی ہے کہ وہ ہر خوف سے مخلصی پائیں ہر ضمیر میں اطمینان ہو۔ ہر بدی سے نجات ہو۔ پس یہ تعلیم کہ یسوع مسیح پر ایمان لانے کے وسیلے سے آدمی راستباز ٹھیر سکتا ہے یہ سارے جہان کے لئے آزادی کا پروانہ ہے۔ اس معنے میں باندھنے اور کھولنے کا اختیار کلیسیا کو دیا گیا ہے۔ اور جس قدر کلیسیا اس تعلیم کو درست طور سے پھیلاتی ہے اُسی قدر وہ اپنا فرض ادا کرتی ہے۔



آٹھواں لکچر

پاکیزہ بننے کا طریقہ

"ہم جانتے ہیں کہ ساری خلقت مل کے چیخیں مارتی اور اُسے پیڑیں لگی ہیں اور فقط وہ نہیں بلکہ ہم بھی جنہیں رُوح کے پہلے پھل ملے اپنے میں کراہتے ہیں اور لےپالک ہونے کی یعنی اپنے جسموں کی رہائی کی راہ تکتے ہیں۔" (رومیوں ۸: ۲۲ و ۲۳) +

رُوح کی عملی زندگی سے متعلق مسیحی تعلیم کے دوسرے مسئلہ کا میں اب ذکر کرونگا یعنی "پاکیزہ بننے کا"۔ مذکورہ بالا بیان کے مطابق اگر ہم یہ تسلیم کریں کہ ہماری اعلےٰ زندگی روحانی جہان کے ساتھ رشتوں پر موقوف ہے اور وہ جہان اشخاص کا جہان ہے اور ان رشتوں میں سے اعلےٰ رشتہ شخص خدا کے ساتھ ہے جس میں ہماری راستبازی سچائی وغیرہ شروع ہوئی اور کمال تک پہنچی ہے۔ اگر ہمارے جیسے فعل مختار لیکن گنہگار اشخاص سے درست رشتہ ان کا ہو سکے تو کسی مقدس شخص کے وسیلے سے ہو سکتا ہے جس کے ساتھ ہمارا اتحاد ہو۔ ہماری روحوں کی نئی پیدائش کے لئے ایسے درمیانی کے ساتھ اتحاد ضروری ہے اور یہی ہماری زندگی کا اعلےٰ مقصد اور کمال ہے کہ باپ اور اس کے بیٹے ہمارے خداوند یسوع مسیح

کے ساتھ ہماری رفاقت ہو۔ چنانچہ یہ لکھا ہے "اگر ہم کہیں کہ ہم اُس کے ساتھ شراکت رکھتے ہیں اور تاریکی میں چلتے ہیں تو جھوٹ بولتے اور حق پر عمل نہیں کرتے۔ پر اگر ہم نور میں چلیں جس طرح وہ نور میں ہے تو ہم ایک دوسرے کے ساتھ شراکت رکھتے ہیں اور اُس کے بیٹے یسوع مسیح کا لہو ہم کو سارے گناہ سے پاک کرتا ہے۔ یہ یوحنا کے خط کے شروع میں تعلیم ہے۔ اور یوحنا کا مقصد اس تحریر سے یہ ہے "اے میرے بچو میں یہ باتیں تمہیں لکھتا ہوں تاکہ تم گناہ نہ کرو"۔ اس شراکت کے لئے ایسی پاکیزگی ضرور ہے کیونکہ یہ شراکت اس پاکیزگی کا چشمہ ہے۔ کیونکہ جب تک ہم باپ اور بیٹے کی رُوح کے ساتھ شراکت نہ ہو ہم اُس کی صورت پر بن نہیں سکتے +

عقیدہ کے شروع میں خلقت کا ذکر ہے پھر اُس مخلصی دہندہ کے تجسم اور دکھوں کے بعد رُوح القدس کا ذکر ہے جو خدا کی ساری امت کو پاک کرتا ہے۔ مگر یہ مسیحی تعلیم آج کل بہت ماند پڑ گئی ہے۔ اور نجات کو لوگوں نے گناہ سے مخلصی پانے کی بجائے محض سزا سے مخلصی پانا سمجھ لیا ہے۔ اور جس ابدی زندگی کا عقیدہ کے آخر میں ذکر ہوا اُس کو محض ایک خیالی آئندہ زندگی سمجھا ہے نہ حقیقی عملی رُوحانی اطمینان اور پاکیزگی کی زندگی۔ جو نہ صرف آئندہ کو حاصل ہوگی بلکہ اب حاصل ہوتی ہے۔ یہ امید کلیسیا کی ہر زمانے میں رہی ہے کہ مسیح کے ساتھ رفاقت رکھنے کے ذریعے ہماری رُوحیں بدی سے اور ہمارے بدن سڑاہٹ سے نجات پائینگے۔ ہم معلمانِ اخلاق نہ اس بات میں مختلف ہیں کہ راستبازی کی پیروی کرنی چاہئے لیکن اس بات میں کہ راستبازی پر چل سکتے ہیں۔ اب جیسا کہ میرا قاعدہ رہا ہے یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ پاکیزہ بننے کی تعلیم انسانی ذات کے تقاضوں کے مطابق ہے

مجملاً تعلیم یہ ہے۔ کہ شخص روح کی تاثیر جب ہماری روحوں پر ہوتی ہے تو ہم میں پاکیزگی پیدا ہوتی اور بڑھتی ہے اور یہ روح نہ صرف براہِ راست اشخاص پر تاثیر کرتی ہے بلکہ مسیحی کلیسیا کی وساطت سے اثر کرتی ہے۔ اور اس کی علت غائی یہ ہے کہ ہمارے بدنوں اور روحوں کو بالکل نیا بنا دے۔ اور عقیدہ کے اس حصہ کے یہی معنی ہیں کہ ہم ایمان رکھتے ہیں روح القدس پر۔ پاک کلیسیا جامع پر۔ مقدسوں کی رفاقت۔ گناہوں کی معافی۔ بدن کی قیامت اور ابدی زندگی پر ❊

یہ طریقہ انسانی ترقی کا ہے۔ البتہ بعض لوگ اس پر اعتراض کرینگے کہ بدن کی ترقی یوں نہیں ہوتی۔ مثلاً کوئی یہ کہے کہ طبعی زندگی کی مختلف صورتوں کا یہ حال نہیں وہاں کسی مجوزہ مترتب عقل کی متواتر تاثیر کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اردگرد کی تاثیروں اور اتفاقات کے ذریعہ یہ صورتیں شکل پکڑتی ہیں مثلاً حیوانات میں بعض خواص ایسے ہوتے ہیں جو ان کی نشو ونما میں مددگار ہوتے ہیں اور جن حیوانات نے خاص نشو ونما پایا ہے ویسا ہی اُن کی اولاد میں ظاہر ہوتا ہے۔ پس وہ کہتے ہیں کہ انسان کے نشو ونما کا بھی یہی حال ہوگا کہ اسی قسم کی تاثیروں سے انسانی اخلاق اور تہذیب نے ترقی پائی۔ اس رائے کا یہ مطلب ہے کہ انسان میں یہ روحانی اخلاقی ترقی اندرونی تاثیر سے نہیں بلکہ بیرونی تاثیروں سے ہوتی ہے۔ اِس لئے کسی روح القدس کی ضرورت نہیں ❊

مخفی نہ رہے کہ یہ بھی اُسی قسم کی ایک مثال ہے جس میں محض طبعی زندگی کی شرائط سے انسانی زندگی کی شرائط مختلفہ میں یہ بتایا گیا تھا کہ انسانی رشتوں کی شخصی سیرت دوسرے رشتوں کی حقیقت سے مختلف ہے۔

طبعی نشو ونما یا ترقی کا ایک اصول یہ ہے کہ ایک خاص نتیجہ یا تو موجودہ اردگرد کی تاثیروں سے ہو یا موروثی تاثیروں سے۔ ان دو قسم کی تاثیروں کے ذریعے سے پودوں اور حیوانوں کی ترقی بتدریج ہوتی ہے۔ مگر انسان کی ترقی میں خواہ وہ مسیحی ہو یا غیر مسیحی ایک اور مختلف تاثیر بھی چاہئے۔ یعنی ایک شخص کی تاثیر دوسرے پر ہوتی ہے۔ محمدی مذہب یا بدھ مذہب کو مثال کے طور پر لے لو۔ ممکن ہے کہ قومی یا تمدنی تاثیروں نے لوگوں کو ان مذاہب کے قبول کرنے کے لئے تیار کر دیا۔ لیکن یہ پوری تشریح نہیں۔ بلکہ اس کے علاوہ محمد اور بدھ کے خیالات اور تصورات اب تک ان کے پیرووں کے دلوں میں زندہ ہیں۔ ان کے ذریعے سے اب تک دیگر لوگ ان مذاہب میں شریک ہوتے اور جو شریک ہو چکے ہیں اُن کے دلوں میں جوش پیدا ہو جاتے ہیں۔ قرآن میں ایک زبردست شخص کی روح گویا دفن ہے اور ہندوستان میں اس وقت تک وہ روح اندر سے باہر کی طرف اثر کرتی رہی ہے اور پشت در پشت لوگوں پر تاثیر کرتی ہے۔ اس لئے یہ کہنا درست نہیں کہ موجودہ واقعات یا موروثی میلانوں کے ذریعے سے بعض قومیں محمدی ہو گئیں اور اب تک محمدی چلی آتی ہیں۔ خاص تاثیر شخصی تھی جو پہلے عرب میں شروع ہوئی اور اس وقت سے اب تک برابر اثر کر رہی ہے ❊

یہی حال بلکہ اس سے بڑھکر مسیحی دین کا ہے۔ اگرچہ کوئی کہے کہ رومی سلطنت کے دنوں میں لوگ ایسے مذہب کے لئے تیار ہو گئے یا لوگوں نے اس مذہب کو گویا موجود کر دیا۔ یہ کہنا ہرگز درست نہیں۔ انسانی ترقی کے دو اصولوں کا امتیاز پولوس رسول نے یوں کیا ہے "اس جہان کے ہمشکل

مت ہو بلکہ اپنے دل کے نئے ہونے سے اپنی شکل بدل ڈالو (رومیوں ۱۲: ۲)
اور وہ بیان کرتا ہے کہ سارے انسان آخر کار اس روحانی تاثیر سے بدل
جائیں گے ۔ وہ انسان کی کل روش پر نظر ڈالتا ہے وہ سارے آدمیوں
کو ایک بدن کے اعضا قرار دیتا ہے اور ہر عضو کو نصیحت کرتا ہے کہ اپنا اپنا مقررہ
کام کرے ۔ خواہ وہ کام دینی خدمت ۔ تعلیم ۔ نصیحت ۔ خیرات ۔ حکومت
اطاعت کا ہو اور وہ بتاتا ہے کہ مسیحی کو کیسا ہونا چاہئے کاروبار میں
آرام میں ۔ خوشی و غم میں ۔ اُمید و مصیبت میں ۔ دوستوں اور دشمنوں
کے ساتھ برتاؤ میں اور ملکی حکومت و اطاعت کا اصول بیان کرتا ہے ۔
آخر کار وہ لکھتا ہے کہ "رات بہت گذر گئی اور دن قریب ہے" جس زمانے
کا یہ دن طلوع ہونے والا ہے اُس کی اخلاقی شرط کو یاد رکھیں ۔ مسیحی دین
بیرونی تاثیروں کا مخلوق نہیں بلکہ اس کا دعوےٰ یہ ہے کہ میں ازلی ہوں
ہر ملک اور زمانہ میں میرا وطن ہو سکتا ہے ۔ شاید میرا مطلب یوں زیادہ
واضح ہوگا ۔ فرض کرو کہ رومیوں کی طرف کا خط پہلے پہل ٹے سی ٹس
(Tacitus) کی تواریخ میں ملے کہ نیرو کے زمانے میں ایک یہودی
نے آ کر یہ تعلیم دی ۔ یہاں کے لوگوں کی حالت پرلے درجے کی بگڑی
ہوئی تھی ۔ چاروں طرف کی تاثیر بالکل خراب تھی یہاں مسیحی محبت اور نور
کے دن کا طلوع ہونا ایک معجزہ ہے کہ "خداوند کے جلال کو شیشہ میں
دیکھ کر جلال سے جلال تک خداوند کی رُوح کے وسیلے اسی صورت پر
بنتے جاتے ہیں" ۔

جیسا مذکور ہوا رسول نے یہ بیان کیا کہ "اس جہان کے ہم شکل مت ہو"
تہذیب تو اردگرد کی تاثیروں سے پیدا ہو سکتی ہے لیکن رسول اس کے

خلاف یہ کہتا ہے کہ اس جہان کے ہم شکل مت ہو اور اردگرد کی تاثیروں
سے متاثر نہ ہو بلکہ وہ زندگی کی ایک نئی صورت ظاہر کرتا ہے کہ "دل کے نئے
ہو جانے سے اپنی شکل بدل ڈالو" ۔ انسانی ترقی کا یہ طریقہ ہے رُوح میں ایک
نئی اندرونی تاثیر پیدا ہوتی ہے گویا چٹان سے ایک پوشیدہ چشمہ پھوٹ نکلتا
ہے یا ایک آگ آسمان سے نازل ہوتی ہے بجائے جہان کے ہم شکل
ہونے کے اُس کے اندر نئی زندگی کا چشمہ پیدا ہو جاتا ہے اور اُس کے ذریعے
ساری شکل بدل جاتی ہے اور یوں کل انسانی ذات کی شکل تبدیل ہو جاتی ہے ۔
اندر کی تاثیر سے نہ باہر کی تاثیر سے دل سے نہ جہان کی طرف سے نئے جنم
سے نہ پرانے کی ترقی سے ۔ رسول کی تعلیم کا یہی مقصد ہے بپتسمہ جس
میں نئی پیدائش اور قیامت کا خیال داخل ہے مسیحی تصور کو ظاہر کرتا ہے
اور انجیل کا یہ بڑا اصول ہے کہ "جب تک آدمی نئے سرے سے پیدا
نہ ہو وہ خدا کی بادشاہت کو دیکھ نہیں سکتا" ۔

مسیحی دین کی تواریخ اس بات کی تواریخ ہے کہ اندرونی تاثیر سے
بیرونی حالت بدل جاتی ہے یسوع مسیح کے اقوال و افعال زندگی کا ایک
لازوال چشمہ ہیں جو انسان کے خیال و روش پر برابر تاثیر کر رہا ہے اور اُن
کو شائستہ بنا رہا ہے ۔ اگستین کے دل پر مسیح کے الفاظ نے تاثیر کی اور
اُس سے متاثر ہو کر اگستین نے اپنے زمانے میں یوروپ کے خیالات پر عجب
اثر کیا ۔ مسیحی شائستگی کے مقدسوں اور پیشواؤں نے اردگرد کی حالت کے
مناظر خانگی اور تمدنی حالت میں تبدیلی کر دی ۔ مثلاً نکاح کا مسیحی تصور نئے
عہد نامہ میں زندہ ہے اور ہر زمانہ کے لوگوں پر یہ نقش کرتا جاتا ہے کہ اُس
اعلےٰ نمونہ اور قانون پر چلنا چاہئے ۔ اٹھارہ سو برس سے لے کر اب اس نے

انسان کی حالت کو بدل ڈالنے میں مدد کی ہے۔ ویسا ہی شخص خدا کے ساتھ انسان کے رشتے کے تصور نے بھی زبردست تاثیر کی ہے۔ تواریخ سے ظاہر ہے کہ اکثر بائبل کے ان ورقوں کے ذریعے نبیوں اور رسولوں کے تصورات آدمیوں کے دلوں پر ٹوٹ پڑے اور ایسی تحریکیں پیدا کر دیں جن کے ذریعے بادشاہتیں اُلٹ گئیں اور قومی زندگی بدل گئی۔ یہ الفاظ بطور بیج کے ہیں ان کے اُگنے اور بڑھنے کے لئے مناسب زمین درکار ہے۔ زندگی ان میں موجود ہے۔ ان میں ایک جلانے والی رُوح ہے جس کے مقابلہ میں جسم کچھ نہیں۔ مادہ تو مردہ اور بلا صورت ہے۔ اس روحانی تاثیر سے اس میں زندگی آتی اور یہ صورت پکڑتا ہے۔ بیشک کسی قدر بیرونی واقعات کی تاثیر ہوتی ہے لیکن اصل تاثیر شخصی اور روحانی ہے +

رُوح کی اندرونی تاثیر کے بارہ میں جو مسیحی تعلیم ہے وہ انسانی تجربہ کے مطابق ہے۔ چنانچہ رسول بدی اور نیکی کی تاثیر کا یوں ذکر کرتا ہے "جیسے ایک شخص کی نافرمانبرداری سے بہت لوگ گنہگار ٹھیرے ویسے ہی ایک کی فرمانبرداری کے سبب بہت لوگ راستباز ٹھیرینگے"۔ گناہ کے داخل ہونے کا بیان جس کی طرف رسول اشارہ کرتا ہے خواہ تواریخی سمجھا جائے خواہ تمثیلی اصول درست ہے۔ ایک آدمی کا گناہ جو باپ یا ہادی یا معلّم ہے نمونہ اور وراثت کے ذریعے ان لوگوں میں از حد ترقی کر جائیگا جو اس کی زیر تاثیر ہونگے۔ اب رسول یہ کہتا ہے۔ اس قسم کی بدتاثیر ایک نیک شخص کی تاثیر سے روکی جائیگی جو راستبازی سچائی اور صحت کا مرکز ہوگا "جیسے گناہ نے موت سے بادشاہت کی ویسے ہی فضل ہمارے خداوند یسُوع مسیح کے وسیلے ہمیشہ کی زندگی کے لئے راستبازی سے بادشاہت کرے گا"+

مسیحی تعلیم رُوح القدس کے بارہ میں بھی بتاتی ہے کہ یہ مرکزی شخصی تاثیر ہر زمانہ میں ہر شخص پر ہو سکتی ہے۔ یہ چند آیتوں سے نتیجہ نہیں نکالا گیا بلکہ یوحنا کی انجیل میں ہمارے خداوند کی آخری تقریروں کا مضمون ہی یہ ہے۔ جو اعتراضات ان باتوں کی صحت پر کئے گئے ہیں اُن کی تردید بالفعل ضرور نہیں۔ ان تقریروں سے یہ مسیحی تعلیم نکلی۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ تعلیم انسانی ذات کے جائز تقاضوں کے مطابق ہے یا نہیں۔ جب یہ تعلیم انسانی ذات کے تقاضوں کے مطابق ہے اور یہ تقریریں اُس تعلیم سے پُر ہیں تو اس سے یوحنا کی انجیل کی صحت کا بھی کچھ ثبوت ملتا ہے۔ ہمارا خداوند اپنے شاگردوں سے رخصت ہو کے جلد جدا ہونے والا ہے اور اُس کے جانے کے بعد جو ہدایت اور تسلی ان کو درکار ہوگی اُس کا ذکر ان تقریروں میں پایا جاتا ہے۔ شاگرد اپنے خداوند کے جُدا ہو جانے کے خیال سے نہایت گھبراہٹ میں تھے اس لئے وہ یوں شروع کرتا ہے "تمہارا دل نہ گھبرائے"۔ اور آخر میں یہ کہتا ہے "میں نے تمہیں یہ باتیں کہیں تاکہ تم مجھ میں اطمینان پاؤ۔ تم دُنیا میں مصیبت اُٹھاتے ہو لیکن خاطر جمع رکھو کہ میں نے دنیا کو جیتا ہے"۔ اثنائے تقریر میں کئی دفعہ اُس نے کہا "تم نہ گھبراؤ نہ تم ڈرو"۔ کیونکہ وہ بخوبی جانتا تھا کہ اُس کے چلے جانے کے بعد شاگردوں کو ایماندار اور وفادار رہنا کیسا مشکل تھا۔ یقین دلانے کے بعد بھی وہ یہ کہتا ہے "کیا اب تم ایمان لاتے ہو۔ دیکھو گھڑی آتی ہے بلکہ آ پہنچی کہ تم میں سے ہر ایک پراگندہ ہو کے اپنی راہ لے گا اور تم مجھے اکیلا چھوڑ دوگے"۔ ہمارے خداوند کو معلوم تھا کہ شاگردوں کی فرمانبرداری اُس کی شخصی تاثیر کے باعث تھی وہ روز بروز اُن کے ساتھ تھا اُن کی نادانی کو دُور کرتا۔ ایمان کو بڑھاتا اور ان کی غلطیوں کی اصلاح کرتا تھا اور شاگرد بھی دل کی گھبراہٹ اور

حیرانی میں اُس کے پاس جاتے اور عرض کرتے تھے کیونکہ اُنہوں نے جان لیا تھا کہ یہ ایسا ہادی ہے جو ہر مشکل میں سے اُن کو نکال سکتا ہے۔ اب وہی ان سے جُدا ہونے کو تھا۔ اس ضرورت کو رفع کرنے کے لئے خداوند نے یہ تقریر کی تھی۔ اور اُن کو یقین دلایا کہ جیسا شخصی رشتہ اُس کا شاگردوں کے ساتھ تھا ویسا ہی شخصی دوست اور ہادی ان کو ملے گا "میں اپنے باپ سے درخواست کرونگا اور وہ تمہیں دوسرا تسلی دینے والا بخشیگا کہ ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے"۔ اس سے ظاہر ہے کہ جیسا تسلی دینے والا ہمارا خداوند تھا ویسے ہی تسلی دینے والے کا وعدہ اُس نے کیا۔ "میں تمہیں یتیم نہ چھوڑونگا۔ میں تمہارے پاس آؤنگا۔ پھر میں نے یہ باتیں تمہارے ساتھ ہوتے ہوئے تم سے کہیں لیکن وہ تسلی دینے والا جو رُوح القدس ہے جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں سب چیزیں سکھائیگا اور سب باتیں جو کچھ کہ میں نے تمہیں کہیں تمہیں یاد دلائیگا"۔

جس موقع اور حالت کے وقت اور جس مقصد کے لئے خداوند نے یہ کلمات فرمائے اُن کا لحاظ کرنے سے مسیحی عقیدہ کے جو رُوح القدس کی شخصیت کے بارہ میں ہے پورے معنے ظاہر ہوتے ہیں۔ آجکل کے لوگ رُوح القدس کو ایک الٰہی تاثیر یا غیر شخص قوت خیال کرتے ہیں۔ لیکن تقریر مذکورہ سے ظاہر ہے کہ یہ موعود تسلی دینے والا ایک شخص ہے جیسے مسیح خود ایک شخص تھا اور جیسے مسیح نے شاگردوں کے ساتھ رہکر تاثیر کی تھی ویسے ہی یہ رُوح القدس شاگردوں پر تاثیر کریگا جس سلامتی کا وعدہ مسیح نے شاگردوں سے کیا تھا اُس کا چشمہ یہی روح ہوگا۔ بیشک مرئی رفیق تو ان سے جُدا ہو جائیگا لیکن ایک غیر مرئی رفیق ان کو ملے گا جو ہمیشہ ان کے ساتھ رہے گا۔ اُس کی تعلیم کا یہ ایک بڑا مشہور خاصہ ہے کہ اکثر قوانین عامہ کے اشتہار کی بجائے وہ ہر ایک کی ضرورت

اور حاجت کے مطابق ہے۔ جن سے وہ مخاطب ہے اُن کے پوشیدہ خیال اور مخفی مزاج اور ان کی خاص کمزوریوں کا لحاظ کرتا ہے۔ مسیح کے جانے سے ایسے رفیق سے وہ محروم ہونے والے تھے اس لئے مسیح نے ویسے ہی رفیق کا اُن سے وعدہ کیا کہ رُوح القدس تم کو ملے گا +

اگر ان لکچروں کی یہ دلیل درست ہو تو معلوم ہو جائیگا کہ ایسے مکاشفہ سے انسانی ذات کی کیسی بڑی ضرورت رفع ہوتی ہے۔ اگر جیسا میں نے ظاہر کیا رُوح کے شخصی رشتے ہیں اور اُن سے وہ مؤثر ہوتی ہے تو ظاہر ہے کہ رُوح القدس کے تسلے سے کیسی بڑی کمی پوری ہو جاتی ہے کیونکہ جب رُوح القدس کی شخصی تاثیر کو وفاداری سے قبول کر لیتے ہیں تو وہ ہمیں ساری سچائی میں چلاتا ہے۔ رسولوں کے نزدیک یہ بڑی برکت تھی کہ ایسے شخص کی صحبت میں رہیں جس کی تاثیر ہمارے خداوند کی طرح تھی۔ جو اُن کے دل کے خیالوں سے پورے طور پر واقف تھا۔ رُوح القدس ایسا ہی رفیق ہے اب ہر شخص اس الٰہی رفیق سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے اس لئے کامل ہدایت کے لئے کسی انسان کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ رُوح القدس کی ہدایت تمیز (کانشنس) کو ملتی ہے۔ اتنی عقل کو نہیں۔ اور جہاں تک یہ تمیز خدا کی طرف مائل ہے ویسے ہی یہ ہدایت اُس کو اچھی لگتی ہے۔ اور جہاں تک اُس روحانی رفیق سے صلاح مشورت لی جاتی ہے وہاں تک ہماری گھبراہٹ اور حیرانگی جاتی رہتی ہے +

جب ہم رُوح القدس پر ایمان رکھتے ہیں تو ساتھ ہی ہم پاک کیتھلک کلیسیا اور مقدسوں کی رفاقت پر اپنا ایمان ظاہر کرتے ہیں۔ آدمی اکیلا نہیں رہتا۔ بلکہ دیگر اشخاص میں رہتا ہے اور اُن کی تاثیر بھی ہوتی ہے۔ جیسے

ہمارا سورج ہے بیشک زمین پر سورج کا اثر اور کشش کام کر رہے ہیں اور زمین سورج کے گرد گھومتی ہے مگر دیگر اجرام فلکی و سیارے بھی جو اسی سورج کے گرد گھوم رہے ہیں ایک دوسرے پر اور زمین پر اثر کر رہے ہیں۔ یہی حال ہمارا ہے ہمارا سورج تو مسیح ہے اور اُس کی تاثیر اُس کی رُوح کے ذریعے ہم پر پڑتی ہے لیکن دیگر مقدس اشخاص کی تاثیر بھی ایک دوسرے پر ہو رہی ہے ہم مقدسوں کی سوسائٹی میں رہتے ہیں ہمارا ایک طرف تو مسیح سے رشتہ ہے دوسری طرف سارے مقدسوں سے اور ہم سب مل کر ایک بدن ہیں۔ اور ہر عضو کی صحت اس باہمی تعلق پر منحصر ہے۔ اور کلیسیا کی ہستی کا یہ قانون ہے کہ "جہاں دو یا تین میرے نام سے جمع ہوں وہاں میں اُن کے درمیان ہوں"۔ جب مقدسوں کی رفاقت زیادہ محسوس کی جاتی تھی تب کلیسیا میں زیادہ سرگرمی اور قوت پائی جاتی تھی دیگر فیلسوفوں اور معلمانِ اخلاق انسانی ذات کی اس ضرورت کو رفع کرنے میں قاصر رہے ہیں۔

بعد ازاں عقیدہ میں ذکر ہے "گناہوں کی معافی بدن کی قیامت اور ابدی زندگی پر" ایمان رکھتا ہوں۔ مسیحی تعلیم کی غائت اور لُبِ لباب اس آخری حصہ میں نظر آتا ہے۔ ایک معترض (میتھو آرنلڈ نامی) نے کہا تھا کہ پولوس کے نزدیک راستباز ٹھہرنے اور پاکیزہ بننے کے ایک ہی معنی ہیں اور اس شخص کی یہ رائے ہے کہ پولوس کو خود معلوم نہ تھا کہ اُس کے دل میں کون سے خاص بڑے اصول تھے اور رومیوں کے خط اپنی رائے کے مطابق ترتیب دیتا ہے۔ حالانکہ میں نے رسول کی ترتیب کے مطابق مضمون کا بیان کیا ہے۔ جب ہم دوسرے مصنفوں کی کتابیں پڑھتے ہیں تب

بھی ان مصنفوں کی ترتیب کو لیتے ہیں نہ کہ ہم اُس ترتیب کو اُلٹ کر اپنی رائے کے مطابق اُس کتاب کو مرتب کرتے ہیں۔ اگر ہم ایسا کریں تو کتاب کا مقصد کبھی سمجھ میں نہ آئیگا۔ پس اگر ہم یہ سمجھنا چاہیں کہ پولوس نے کس انجیل کی منادی کی تو ہم انہیں کی ترتیب اور طریقہ کو اختیار کریں۔ رومیوں کے خط کے پانچویں باب کے آخر میں یہ ذکر آیا تھا کہ خدا کا فضل اور معافی سب کے لئے ہے۔ پھر مابعد تین بابوں میں وہ بتاتا ہے کہ اس فضل اور معافی کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ہماری روحیں اور بدن سرایت کے قبضۂ اختیار سے نجات پاتے ہیں۔ ان بابوں کا خاص مضمون موت اور قیامت ہے۔ "مسیح مُردوں میں سے جی اُٹھا پھر نہیں مرنے کا اور موت پھر اُس پر اختیار نہیں رکھتی کیونکہ وہ جو موا سو گناہ کی نسبت ایک بار مُوا پھر جو جیتا ہے سو خدا کی نسبت جیتا ہے اسی طرح تم بھی آپ کو گناہ کی نسبت مُردہ پر خدا کی نسبت ہمارے خداوند یسوع مسیح کے وسیلے زندہ سمجھو"۔

یہ بالکل سچ ہے کہ ان الفاظ کو محض طبعی زندگی اور موت پر عائد نہیں کرسکتے البتہ ان کو خارج بھی نہیں کرسکتے۔ جب رسول یہ کہتا ہے کہ "رُوح راستبازی کے باعث زندہ ہے" تو وہ یہ بھی کہتا ہے "پھر اگر اُس کی رُوح جس نے یسوع کو مُردوں میں سے جلایا تم میں بسے تو مسیح کا جلانے والا تمہارے مُردہ بدن کو بھی اپنی اُس رُوح کے وسیلے جو تم میں بستی ہے جلائیگا"۔ ان بابوں میں رسول اپنا تجربہ بھی بتاتا ہے کہ وہ خود اندرونی بدی کا یا بدی کی شریعت کا مقابلہ نہ کرسکا۔ اس نے یہ سمجھا کہ مسیح کی قیامت اس بات کا وسیلہ اور نشان ہے کہ ایسا بد میلان مغلوب ہو سکتا ہے۔ اور اپنے تجربہ سے اس امر کا یقین دلاتا ہے کہ جس نے یسوع مسیح کا بپتسمہ پایا ہے اور ایمان کے

ذریعے اُس میں بنتا ہے یہ زندگی بخش تاثیر اُسے ابھی حاصل ہے۔ یعنی اندرونی
شخصیت میں بدن اور رُوح کی کامل تبدیلی کا یہ پیمانہ ہے اور رُوح کے یہ
پہلے پھل ہیں کہ ہماری رغبتیں اور خواہشیں پاک ہو جائیں۔ البتہ جب تک
یہ پُرانا انسان باقی ہے یہ پاکیزگی کامل نہیں ہو سکتی لیکن دل و جان اور
رُوح میں اِس نئے انسان کا تجربہ کر سکتے ہیں جو راستبازی اور حقیقی پاکیزگی
میں خدا کی صورت پر پیدا ہوا ہے۔ وہ ایسی زندگی اور اطمینان کا تجربہ
کرا جاتا ہے۔ پس موت کے بپتسمہ کے سبب اُس کے ساتھ گاڑے
گئے تاکہ جیسے مسیح مُردوں میں سے باپ کے جلال کے وسیلہ سے اُٹھایا
گیا ویسے ہی ہم بھی نئی زندگی میں قدم ماریں۔

الغرض پاکیزہ بننے کے مسئلہ کا یہ مقصد ہے کہ ہماری کل ذات
بدن اور رُوح ایک قسم کی تحلیل کے قابل ہے اور ہماری مخلصی بحالگی
کے ذریعے ہو سکتی ہے اور یہ بحالگی ایک طرح ویسی ہی ہے جیسے نئے
بدن کی قیامت ہوتی ہے۔ بعضوں نے یہ تفسیر کی ہے کہ مسیح کے اتحاد
ہمدردی رکھنے کی تاثیر سے ہماری خواہشیں نئی ہو جاتی ہیں یا اُن کی تجدید
ہو جاتی ہے۔ ہم اُس پر کچھ اعتراض کرنا نہیں چاہتے۔ چنانچہ عیدِ قیامت
کی دُعا میں یوں آیا ہے کہ اے قادرِ مطلق خدا تو نے اپنے اکلوتے بیٹے
یسوع مسیح کے وسیلے سے موت کو مغلوب کر کے ہمارے لئے ابدی زندگی کا
دروازہ کھول دیا ہم عاجزی سے تیری منت کرتے ہیں کہ جس طرح تو پہلے
سے خاص فضل کر کے ہمارے دلوں میں نیک ارادے ڈالتا ہے اسی
طرح ہر وقت ہماری مدد کر کہ ہم انہیں نیک انجام تک پہنچا سکیں۔

ارادہ یا خواہش بہت وسیع لفظ ہے۔ کسی نہ کسی قسم کی خواہش یا

ارادہ زندگی کا خاص جزو ہے انہیں اجزا کے باقاعدہ اور مناسب ہونے پر
ہماری خوشحالی مبنی ہے۔ یہ زندگی خواہشوں اور ارادوں کی ایک دراز لڑائی
ہے۔ ایک وقت اچھی خواہشوں اور نیک ارادوں نے ہم سے اچھے کام
کروائے۔ دوسرے وقت بد ارادوں اور جسمانی خواہشوں نے آنکھوں کی
خواہش اور زندگی کے غرور نے ہم کو اعلےٰ مقاصد سے بھٹکا دیا۔ کم و بیش
ہر ایک کے بھٹکنے کا باعث یہی خواہشیں ہیں۔ نیک و بد خواہشوں کی
لڑائی ہوتی ہے کسی میں نیک خواہشیں غالب آتی ہیں کسی میں بد خواہشیں۔
اس لڑائی میں بہتیرے زخمی اور قتل ہو چکے ہیں۔ بعض شخصوں میں ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ بد خواہشوں نے غلبہ حاصل کر کے نیک خواہشوں کو تقریباً کالعدم
کر دیا ہے۔ بعضوں میں نیک خواہشوں نے بد خواہشوں کی تقریباً بیخ کنی
کر دی ہے۔ مذکورہ بالا دُعا سے ظاہر ہے کہ خدا کے فضل سے یہ نیک
خواہشیں ہم میں پیدا ہو سکتی ہیں اور اسی کی متواتر مدد سے ان خواہشوں
کو نیک انجام تک پہنچا سکتے ہیں پس یہ لفظ ارادہ یا خواہش انسانی زندگی
کے لبان چوڑان اونچان پر حاوی ہے۔

مخفی نہ رہے کہ قیامت کا تصور خواہ بدن کی قیامت ہو یا رُوح کی
بقا کے تصور سے متفرق ہے۔ بقا کا تصور تو صرف مسیحی دین کا خاصہ
نہیں۔ بلکہ کم و بیش سارے انسانوں میں پایا جاتا ہے۔ نہ آئندہ جزا و سزا
کا خیال ہمارے دین میں محدود ہے۔ بلکہ جہان کے مذاہب میں اس کا بہت
چرچا ہے۔ لیکن قیامت کے بارہ میں جو مسیحی تصور ہے وہ ان دونوں سے
کہیں اعلےٰ ہے۔ کیونکہ یہ اور بات ہے کہ رُوح مرنے کے بعد باقی رہے گی
بدن کے ساتھ اتحاد ہو یا نہ ہو۔ اور یہ اور بات ہے کہ رُوح نئی زندگی

نئی پیدائش اور نئی قوت اور نیا بدن حاصل کریگی۔ ہوسکتا ہے کہ آدمی ہمیشہ تک زندہ رہے اور موجودہ کمزوریاں نقص اور بدخواہشیں اُس کے ساتھ لگی رہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو بہت لوگ اس جہان کے بعد اگرچہ وہ مسیحی ایمان دجال کے ساتھ انتقال کرگئے ناقص لنگڑی بقا کو حاصل کرتے۔ یہ قیامت جسے مسیح نے روشن کردیا زندگی اور عدم سرایت ہے (۲ تمط ۱: ۱۰) مسیح کی قیامت اس امر کا یقین دلاتی ہے کہ ہم اس جہان کے بعد محض جیتے نہ رہینگے بلکہ نئی زندگی میں قدم ماریں گے اور بدن اور رُوح دونوں پر یہ قول صادق آتا ہے کہ "وہ فنا میں بویا جاتا اور بقا میں اُٹھتا ہے۔ بے حرمتی میں بویا جاتا اور جلال میں اُٹھتا ہے کمزوری میں بویا جاتا اور زورآوری میں اُٹھتا ہے"۔

بدن کی قیامت سے رُوح کی قیامت زیادہ عجیب ہے۔ کیونکہ یہ تو قرین قیاس ہے کہ جو زندگی کا چنگارا ایک وقت گوشت اور لہو سے ملبس ہوا تھا وہ پھر گوشت اور لہو سے ملبس ہو جائے۔ لیکن رُوح انسانی میں بعض ایسی اشیاء ہیں جو غیرفانی نظر آتی ہیں مثلاً تاثیریں۔ عادتیں دل کی رغبتیں وغیرہ جن سے آزاد ہوجانا تقریباً ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ خاص کر آج کل کے زمانے میں جبکہ یہ مسئلہ مانا جاتا ہے کہ بدن پر دائمی تاثیریں ہوتی ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ رُوح اور بدن کا کیسا قریب رشتہ ہے۔ محض ہمدردی یا نمونہ کی تاثیر سے یہ باتیں دور نہیں ہوسکتیں۔ جب آدمی کسی اُلجھانے والے گناہ سے جنگ کرتا ہے تو فتح پانے کے بعد بھی کچھ داغ باقی رہ جاتا ہے۔ پس کیسی مبارک وہ حالت ہوگی جس کا ذکر مقدس یوحنا نے کیا ہے کہ جب مسیح ظاہر ہوگا تو ہم اُس کی مانند ہوں گے۔ جیسے ہم اُس کی موت کی مشابہت میں شریک ہوتے ویسے اُس کی قیامت کی مشابہت میں بھی شریک ہونگے

اس برکت وعدہ مسیح نے خدا کے فرزندوں سے کیا ہے۔

محض اخلاق کی بنا پر تواتر کے سخت قانون کا توڑنا ناممکن ہے۔

فرض کرو کہ آدمی پر طبعی قوتوں ہی کی تاثیر ہورہی ہے تو جو خواہشیں اور ارادے بگڑ چکے ہیں اُن کی بحالی اُن کا کمال اُن کی پاکیزگی ناممکن ہوگی۔ طبعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں (جیسا گر نے صاحب نے کہا ہے) کہ گناہ معاف نہیں ہوسکتا۔ بدی جو سرزد ہوئی ہے اُس کی تلافی ناممکن نظر آتی ہے اگرچہ ہم آگے کو بدی کرنا چھوڑ دیں تو بھی روحانی قابلیتوں کے کمال تک ہم پہنچ نہیں سکتے۔ پس انسانی ذات کے مطابق کس کی تعلیم ہے معلمانِ اخلاق کی یا رسول کی جو یہ کہتا ہے "اس موت کے بدن سے کون مجھے چھڑائیگا"۔ اور یہ ویسا ہی معجزہ ہے جیسے مسیح کا مُردوں میں سے جی اُٹھنا جس انجیل کی منادی رسول نے کی اُس کی یہ غایت برکت ہے "جو جسم میں ہیں وہ خدا کو خوش نہیں کرسکتے کیونکہ وہ پاکیزگی اور اُن کے نیک ارادوں کی تکمیل اُنہیں حاصل نہیں ہوسکتی جو خدا چاہتا ہے"۔ "پر تم جسمانی نہیں بلکہ روحانی ہو بشرطیکہ خدا کی رُوح تم میں بستی ہے پر جس میں مسیح کی رُوح نہیں وہ اُس کا نہیں اور اگر مسیح تم میں ہے تو بدن گناہ کے سبب مُردہ ہے پر رُوح راستبازی کے سبب زندہ۔ پھر اگر اُس کی رُوح جس نے یسوع کو مُردوں میں سے جلایا تم میں بسے تو مسیح کا جلانے والا تمہارے مُردہ بدن کو بھی اپنی اُس رُوح کے وسیلے جو تم میں بستی ہے جلائیگا"۔

کسی نہ کسی طرح سے یہ پُرانا انسان مرنا چاہیے تب نیا انسان اپنے پیدا کرنے والے کی صورت پر نیا بنتا جائیگا۔ پس جب یہ فانی غیرفانی کو اور یہ مرنے والا ہمیشہ کی زندگی کو پہن چکیگا تب وہ بات جو لکھی ہے پوری ہوگی کہ فتح نے

موت کو نگل لیا۔"

الغرض نئے عہدنامہ میں یہ زندگی ایک لڑائی قرار دی گئی ہے لیکن بعض
عالموں نے یوں بیان کیا ہے کہ ہم نے فوق الفطرت مذہب کو چھوڑ کر یہودی خدا
کی بجائے ہمہ جا حاضر خدا کو قبول کر لیا ہے جس کی سلطنت میں سے ابتری اور
پراگندگی بالکل خارج ہے۔ لیکن یہ تو عام تجربہ کے خلاف ہے۔ یہ ابتری اور
پریشانی تو پائی جاتی ہے۔ اس لئے رسول واقعہ کے مطابق کہتا ہے" "ہم
جانتے ہیں کہ ساری خلقت مل کے اب تک چیخیں مارتی ہے اور اسے پیڑیں
لگی ہیں اور فقط وہ نہیں بلکہ ہم بھی جنہیں روح کے پہلے پھل ملے اپنے میں
کراہتے ہیں اور لے پالک ہونے کی یعنی اپنے جسموں کی رہائی کی راہ تکتے ہیں"
اس سے ظاہر ہے کہ کہاں تک مسیحی تعلیم نوع انسان کی ضرورتوں کے مطابق
ہے۔



دوسرا حصہ

لیکچر اوّل

"وہ راستی جو خدا کی طرف سے ہے سو اس میں ظاہر ہے کہ ایمان سے
ایمان تک ہے جیسا کہ لکھا ہے کہ راستباز ایمان سے جیتا رہیگا" (رومیوں ۱: ۱۷)

اس سلسلے کے شروع میں یہ بتا دینا مناسب ہے کہ کس بات کو
ان لیکچروں میں مدنظر رکھا ہے۔ آجکل کی کم اعتقادی پہلی صدیوں کی کم اعتقادی
سے خاص کر گزشتہ صدی کی کم اعتقادی سے ایک خاص امر میں متفرق ہے
وہ فرق یہ ہے کہ آجکل اخلاق کے فرض کو لوگ دل وجان سے تسلیم کرتے ہیں
اور مسیحی مکاشفہ کے قبول کرنے میں تامل اس لئے نہیں کرتے کہ اس پر
چلنا نہیں چاہتے لیکن اس لئے کہ جو عقیدہ یہ دین پیش کرتا ہے اس کو ضروری
نہیں سمجھتے۔ چنانچہ آجکل کے عالم و معلمان اخلاق نیکی کی حمایت تقریباً ویسی
ہی کرتے ہیں جیسی کہ مسیحی دین کے عالم کرتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ
نیکی کی حمایت دین میں شامل ہے۔ اور اگر عموماً لوگ مسیحی دین کو ترک کر دیں
تو وہ اعلےٰ اخلاق کے چشمے اور پشتے کو کھو دینگے۔ اور مسیحی کلیسیا کے اس اعلےٰ
روحانی مرتبے سے گرنا سخت خطرناک ہے۔ اگر ہم مسیحی عقیدے کو ایک
پہاڑ سے تشبیہ دیں تو جو لوگ اس عقیدے سے گرے ہیں شکر کی بات ہے

کہ وہ چوٹی سے نیچے گر اڑے ہی پر گرے ہیں۔ بالکل نیچے نہیں آ پڑے۔ جب کہ ہم اُلٹے چوٹی پر پہنچنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں ہمارے رفیق جو پیچھے رہ گئے ہیں وہ بہت دُور ہیں ہماری آواز اُن تک پہنچ سکتی ہے اور ابھی اُن کے ساتھ کچھ رفاقت باقی ہے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم اور ہمارے ہمجنس راستبازی حاصل کریں۔ البتہ ہم مسیحیوں کے لئے یہ راستبازی الٰہی دائمی محبت میں منتقل ہو جاتی ہے۔ آخری خوشحالی خواہ کیسی ہو راستبازی اُس کی ضروری شرط ہے۔ اس لئے مباحثہ آجکل مقصد کے بارے میں نہیں بلکہ وسیلے کے بارے میں ہے۔ پولوس رسول یہ کہتا ہے کہ میں مسیح کی انجیل سے شرماتا نہیں۔ اس لئے کہ وہ ہر ایک کی نجات کے واسطے جو ایمان لاتا خدا کی قدرت ہے۔ سو اسی میں "خدا کی راستبازی" ظاہر ہے۔ اگر یہ درست ہو کہ مسیحی دین راستبازی کے مکاشفے کے ذریعے نجات کے لئے خدا کی قدرت ہے تو جو بڑی مشکلات اس کے قبول کرنے کے بارے میں ہیں وہ کافور ہو جاتی ہیں۔ جس انجیل کی منادی مقدس پولوس نے کی اگر وہ اخلاق کی گہری بنیاد ظاہر کرتی ہے جس سے اخلاق کی بنیاد و تکمیل پاتی اور جو راستبازی کے بھوکے پیاسے ہیں اُن کی ضرورتوں کو رفع کرتی ہے تو یہ دلیل اس انجیل کی تائید میں ہے اور آجکل ایسی دلیل کا بڑا زور سمجھا جاتا ہے۔

آجکل کے خیالات عالموں کی تصنیفات سے معلوم ہو سکتے ہیں چنانچہ ایک عالم "کنٹمپوریری ریویو" اپریل ۱۸۷۵ء اس کا ذکر کرتا ہے۔ زیادہ روشنی اور مدد کے لئے یہ خیر باد کرتا ہے۔ کیونکہ جنہوں نے مسیحی عقیدے کو چھوڑ دیا ہے وہ بے یقینی اور شک کی دھار میں بہے جا رہے ہیں اور حیران پریشان ہیں۔ یہ مصنف کہتا ہے کہ اگر لوگوں کو یقین ہو جائے کہ حق یہ ہے تو بہت

لوگ اُس پر چلیں گے۔ اگر اُن کو یقین ہو جائے کہ یہ نیک بات ہے تو اپنی ساری زندگی دوسروں کی بھلائی کے لئے مخصوص کر دینگے۔ لیکن ان کو یقین نہیں اس لئے اُن کی زندگی بلا اصول و مقصد گزرتی جاتی ہے۔ اور یہ مصنف اسے اپنے شائستہ زمانے کی ایک "لعنت" ٹھہراتا ہے۔ بلکہ اُس کا خیال ہے کہ "روز افزوں لعنت" ہے۔ آجکل وہ زمانہ ہے کہ حق پر چلنا تو چاہتے ہیں لیکن اُن کو پتا نہیں کہ حق کیا ہے۔ آجکل اسی قسم کا مزاج پایا جاتا ہے جو مسیحی دین کے آغاز میں تھا اور اُس وقت یہ مزاج رومی سلطنت کی قوت چوس رہا تھا۔ اس قسم کے مزاج کے لئے جو علاج اُس وقت پیش کیا گیا تھا وہی اب پولوس رسول پیش کرتا ہے اور اگر لوگ اس علاج کو رد کرینگے تو کچھ افسوس و تامل سے رد کرینگے نہ ہنسی ٹھٹھے میں اُسے اُڑا دینگے۔

اسی کے مطابق گزشتہ لکچروں کے سلسلے میں یہ ظاہر کرنے کی میں نے کوشش کی تھی کہ مسیحی عقیدے کے بڑے بڑے اصول خاصکر جو گناہ اور مخلصی کی ضرورت اور وسائل کے بارے میں تھے وہ ہماری تمنائے راستبازی کو پورا کرتے اور دل تقاضوں کے مطابق ہیں اور دلیل کی بنیاد یہ رکھی گئی تھی کہ انسانی راستبازی شخصی رشتوں پر مشتمل ہے اور یہ بتایا گیا تھا کہ اخلاقی راستبازی بدنی صحت کی مانند نہ تھی کہ خاص بدن یا شخص کا لحاظ کیا جائے بلکہ باہمی شخصی رشتوں کی صحت پر تھی۔ الغرض ہم یہ کہیں گے کہ محبت میں راستبازی داخل ہے لیکن راستبازی میں محبت داخل نہیں۔ یہ اصول آجکل کی مشکلات کی گویا کنجی ہے اور میں آگے چل کر اس اصول کی تشریح کرونگا۔ اگر کوئی ہمارے شخصی رشتوں کی حقیقت اور امکان پر خواہ وہ شخص خدا سے رشتہ ہو یا ایک دوسرے سے شک ڈالے تو وہ مسیحی زندگی کے درخت کی

جڑ پر کلھاڑا رکھ دیتا ہے۔ اس پر زیادہ غور کریں ۔

مسیحی راستبازی کی کامل تعریف یہ ہے کہ خدا کو اپنے سارے دل وجان عقل اور طاقت سے پیار کرے اور اپنے پڑوسی کو اپنے جیسا۔ یہ تعریف رُوحانی وجود کی ہستی پر دلالت کرتی ہے کہ جس سے ویسا ہی سلوک کرنا چاہیئے جیسا ہمیں ایک دوسرے سے کرنا چاہیئے۔ اور مذہب کا خاص مقصد بھی یہ ہے کہ اُس وجود کا علم حاصل کریں اور اُس سے رفاقت حاصل کریں۔ جو وعظ پولوس نے اہل اتھینی کو سُنایا وہ آجکل کے لوگوں کے مناسب حال بھی ہے۔ اگر پولوس آج یہاں ہوتا آجکل کے خیالات کو معلوم کرتا اور آجکل کی تصنیفات کو پڑھتا تو وہ یہی کہتا کہ میں لوگوں کو "نا معلوم خدا کی عبادت کرتے دیکھتا ہوں۔ جو الفاظ اتھینی مذبح پر کندہ تھے "نا معلوم خدا کے لئے" وہ آجکل کے خیالات پر بہت صادق آتے ہیں اس لئے پولوس اُن کو یہ بھی سچا پیغام پہنچاتا کہ "جس کو تم نا معلوم کہتے پوجتے ہو میں تم کو اُسی کی خبر دیتا ہوں"۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ پولوس کے دل میں (جیسے میتھو آرنلڈ صاحب کہتے ہیں) راستبازی کی خواہش کا بڑا خیال تھا۔ لیکن اگر ہم سمجھیں کہ صرف یہی سارا خیال اس کے دل کا تھا تو بالکل غلط ہوگا وہ یوحنا کی طرح پورے طور سے تسلیم کرتا ہے کہ آخر کار محبت غالب آئیگی۔ خواہ اس کا مقصد کچھ ہی ہو وہ خدا اور اُس کے ساتھ جو ہمارا رشتہ ہے اُس کو مدِّ نظر رکھتا ہے وہ الہٰی ہدایت سے اپنی تعلیم کو اپنے سامعین یا ناظرین کے مزاج کے مطابق صورت دیتا ہے۔ چونکہ رومی لوگ قانون راستبازی یا انصاف کو خاص عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اس لئے وہ راستبازی پر زور دیتا ہے جو انجیل سے ظاہر ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ یہ کہتا ہے کہ اے رومیو تم جو راستبازی

کو پیار کرتے ہو انجیل میں یہ راستبازی تم کو ملے گی۔ پھر بھی وہ شروع میں انسان اور خدا کے رشتے کو بتا دیتا ہے۔ ایسا ہی جب یونانیوں سے وہ مخاطب ہے تو الٰہی ذات اور مرضی پر خاص زور دیتا ہے ۔

اب زیر بحث امر یہ ہے کہ جیسے مسیحی اخلاق جو مقدس نوشتوں میں مندرج ہے انسان کی ذات کے مطابق ہے کیا ویسے ہی مسیحی عقائد بھی انسان کی ذات اور اس کے تقاضوں کے مطابق ہیں یا نہیں ۔

شروع میں ایک دقت پیش آتی ہے اُس کو دور کرنا مناسب ہوگا۔ اس علم و سائنس کے زمانے میں لوگ ہم سے یہ چاہتے ہیں کہ ہم اپنے عقیدے کا ثبوت سائنس کے ذریعے سے دیں۔ اس مطالبے کی بنیاد یہ ہے کہ جیسے دیگر دنیاوی امور میں ہم علمی دلائل پیش کرتے ہیں ویسے اخلاقی مشکلات کے رفع کرنے میں پیش نہیں کر سکتے۔ علمی سائنس کی ترقی نے آجکل لوگوں کے دلوں پر بڑی تاثیر کی۔ اور اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ جیسے طبعی یا کیمیائی اُمور کو ہم پرکھتے ہیں ویسے ہی مذہبی اصول کو پرکھیں اور ایسا علمی ثبوت طلب کرتے ہیں جیسے آگ کو ہاتھ لگانے سے ہاتھ جل جاتا ہے اور شک باقی نہیں رہتا ویسا ہی مذہبی تعلیم کا ثبوت ہونا چاہیئے۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ ایک وجود موجود ہے جو حکمران ہے جسے ہم مشخص علت اولی کہتے ہیں جو عالم کا ذی عقل اخلاقی حاکم ہے لیکن ہم اس کا بھی ایسا ثبوت نہیں دے سکتے جیسے یہ کہ آگ جلا دیتی ہے۔ پس اگر ہم اس بنیادی اصول کو ثابت نہیں کر سکتے تو ہمارا کل عقیدہ بے بنیاد ٹھہرے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ جس کے بارے میں ہم ایسا ثبوت نہیں دے سکتے اُس کو ہم ایک رائے کہہ سکتے ہیں لیکن زندگی و عمل کی بنیاد نہیں ٹھہرا سکتے۔ جان سٹوارٹ مل کے ایک

رسالہ میں اس اصول کی ایک مثال ہے۔ یہ مصنف خدا کی ہستی اور انسان کی بقا کو ممکنات سے قرار دیتا ہے۔ وہ اپنے سے ہی یہ سوال کرتا ہے کہ آیا محض تصور کے طبقے میں امید رکھنا خلاف عقل ہے اور اس معقول اُصول سے تجاوز کرنا ہے جو یہ ہے کہ بذریعہ شہادت خیال و رائے کو درست کریں۔ اس مصنف کے اتنے کہنے پر بھی اس کے بعض رفیقوں نے بُرا منایا۔

جائز عقیدے کے لئے ہم مسیحی لوگ اُس کو کوئی معیار قرار نہیں دے سکتے۔ چنانچہ لکچر کے شروع میں اس کا ذکر آیا کہ خدا کی راستبازی اس میں ظاہر ہے۔ کہ وہ ایمان سے ایمان تک ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ راستباز ایمان سے جیئیگا۔ حال کے عالموں کے اصول کو یوں بیان کر سکتے ہیں کہ وہ سائنس سے سائنس تک ہے یعنی ان کے مطابق راستبازی کا اصول سائنس پر مبنی ہے اور جوں جوں سائنس ترقی کرتی ہے یہ اصول بھی ترقی کرتا ہے۔ لیکن پولوس کے مطابق یہ راستبازی ایمان سے ایمان تک ظاہر ہوتی ہے یعنی یہ ایمان سے شروع ہوتی ہے اور جوں جوں ایمان ترقی کرتا ہے یہ راستبازی بھی ترقی کرتی جاتی ہے۔ یہاں میں کسی مباحثے کی طرف اشارہ نہیں کرتا اور نہ میں اُن کے معنے محدود کرتا ہوں۔ بلکہ یہ معنی خود بخود واضح ہوتے جائینگے۔ ہم ان لفظوں کو عام معنی میں لے کر سائنس والوں کے اصول کے ساتھ پولوس رسول کے اصول کا مقابلہ کریں۔

دنیا کی تواریخ پر نظر ڈالیں کہ نوع انسان نے کس طرح راستبازی میں ترقی کی۔ ایمان کے عام معنی یہ ہیں کسی پر بھروسہ رکھنا۔ انسان کی اخلاقی تربیت کا عام وسیلہ یہی ایمان ہوا ہے۔ تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ متواتر ایسے اشخاص برپا ہوئے جن کو اپنے ہمعصروں سے اعلےٰ راستبازی حاصل تھی

ان کے نمونے حکم قانون وغیرہ کے ذریعے سے باقی لوگ اُن پر بھروسہ کرنے لگے اور ان کے پیرو ہو گئے۔ موسےٰ۔ سقراط۔ بدھ۔ کنفیوشس وغیرہ کا حال معلوم ہے انہوں نے علم اخلاق میں تجربے نہیں کئے تھے اور نہ اس یا اُس فعل راستبازی کو قوم پر یا اپنے پیرؤوں پر سائنس کے طور پر ثابت کیا تھا۔ انہوں نے محسوس کیا بھروسہ کیا اُمید کی عمل کیا۔ ان کی تاثیر سے دوسروں پر تاثیر ہوئی اور یا اُن کا رعب ان پر چھا گیا اور خوشی سے یا لاچاری سے اُن کی ہدایت پر چلے اور ہم جانتے ہیں کہ نوع انسان کے ان مصلحوں نے کیسی ترقی کی تھی۔ مثلاً بدھ نے اخلاق کے ایسے اعلےٰ اصول تجویز کئے کہ عقل حیران ہوتی ہے اور وہ اپنے ہمعصروں سے ان تصورات میں ایسا ہی اعلےٰ ہوگا جیسا کوہ ہمالیہ ہندوستان کے میدانوں سے۔ بیشمار اُس کے شاگرد ہو گئے۔ نہ اس لئے کہ بذریعہ سائنس اُس کی ہدایات کا تجربہ کیا یا اس کی نصیحتوں کو پرکھا۔ اُس کے پیرو تو ہمیشہ اُس سے کہیں نیچے تھے اُس کی اعلےٰ ہدایات کو پرکھنے کا اُن میں مادہ ہی نہ تھا۔ لیکن وہ اُس پر ایمان لائے اور اُس ایمان کے ذریعے دوسروں سے سرافراز ہو گئے اور اس شخصی بھروسہ کے ذریعے زندگی کی اعلےٰ منزل پر پہنچ گئے۔

اس سے بھی بڑھکر مثال مسیحی کلیسیا اور مسیحی اخلاق کی تواریخ سے ملتی ہے۔ یہ اخلاق مسیح کے اقوال اور رسولوں کی تعلیم سے شروع ہوا۔ دنیاوی مورخوں اور نیز نئے عہدنامہ میں بھی اس وقت کی تہذیب کا ذکر ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ مسیحی دین نے اُس تہذیب اور اخلاق میں اپنی تعلیم کے ذریعے ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ کیسے یہ وقوع میں آیا۔ کیا ان اقوال اور اس تعلیم کو علمی طور سے پرکھنے کے ذریعے؟ نہیں بلکہ پیشتر اس سے کہ ایسا تجربہ ہو۔ بلکہ

یہ تجربے پیچھے ہوئے۔ پہلے تو ان لوگوں نے مسیح کی سُنی اُسے پیار کیا اور اُسی پر بھروسہ رکھا اور مابعد لوگوں نے انہیں ہادیوں کی تعلیم کو قبول کر لیا۔ قدیم مسیحی کلیسیا کا یہ خاصہ تھا کہ وہ بڑے جوش و سرگرمی سے اپنے ہادیوں سے لپٹے رہے کہ جو کچھ اُنہوں نے کہا اُسے قبول کیا اگرچہ سب کچھ چھوڑنا اور نقصان اُٹھانا پڑا۔ یوں کلیسیا کی تواریخ سوسائٹی کی تواریخ ہے جو باہمی بھروسہ و شراکت کے ذریعے ترقی کرتی ہے۔ سائنس کے سکول کی طرح نہیں جس میں شاگردوں کی عقلی رضامندی کم و بیش درکار ہوتی ہے۔

بات تو یہ ہے کہ اگر انسانی ذات کا یہ قانون نہ ہوتا تو تجربہ اور فیصلہ بھی جس کا معترض ہم سے مطالبہ کرتے ہیں وہ علمِ اخلاق کے ضروری اصولوں میں بھی ناممکن ہو جاتا۔ اگر مجھے بدن کی صحت کی فکر ہے تو میں دوائی استعمال کرتا ہوں اور نتیجہ کا منتظر رہتا ہوں۔ کیونکہ دوائی کی تاثیر میرے قابو میں نہیں وہ خود بخود ہو گی۔ کچھ مضائقہ نہیں کہ مجھے اُس دوائی پر بڑا بھروسہ یا کم اعتقاد ہے اگر اس دوائی کی کوئی خاص تاثیر ہے تو وہ بلا میری مرضی و رضامندی اپنا نتیجہ پیدا کرے گی۔ لیکن اخلاقی دوا یا نئی اخلاقی عادت کی تحصیل کے لئے میرے دل کی رضامندی میری مرضی اور میرے خیالات کی ہمدردی مطلوب ہے میں بلحاظ تجربہ کے محبت نہیں کر سکتا۔ بلحاظ رائے کے سچا نہیں ہو سکتا عارضی طور پر پاک نہیں ہو سکتا یا نتائج کا باریک مشاہدہ کرنے سے بے غرض نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ پہلے تو اجتماع ضدین ہیں۔ بلکہ اس کوشش میں میری ساری مرضی اور دل مصروف ہونا چاہئے اور پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ہر خواہش کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ ایسے شخص تو ہوتے ہیں جو اپنی صفائی قلب کے ذریعے سے دور ہی سے دل کی ان ناجائز رغبتوں پر نظر مار سکتے ہیں لیکن نئے عہد نامے

کے خطوط سے ظاہر ہے کہ عموماً ایسی تاثیر پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے۔ پولوس رسول نے مسیحیوں کے درمیان شادی کے رشتے کی تلقین کی۔ اور یہ اس نے اپنے اختیار سے کیا اور اُسی کے اختیار سے یہ نیا رشتہ قائم ہو گیا۔ اور یہ بھی چھپا نہیں کہ اخلاقی عادات اور تمدنی دستورات طبعی حالات سے زیادہ نازک اور پیچیدہ ہوتے ہیں۔ طبعی بیماریوں کی نسبت اخلاقی بیماریوں میں اس قول کی صداقت زیادہ ظاہر ہوتی ہے کہ میں باپ دادوں کی بدیوں کی سزا اُن کی اولاد کو دیتا ہوں یہ قومی عادات اور ایسے میلانوں کی شاہد ہے جس کے ذریعے آخر کار قوم تباہ ہو گئی۔

اگر ہمارے باپ دادا کثرتِ ازدواج یا وحدتِ ازدواج کا تجربہ کرنے تک ٹھہرے رہتے اور پہلے مسیحی معلموں کی ہدایت کے مطابق نہ چلتے تو اس تہذیب کا کیا ٹھکانا ہوتا جس پر آج ہم فخر کرتے ہیں۔ عام طور پر کہنا کہ راستبازی کے نتائج کو پرکھنا چاہئے بالکل اور بات ہے لیکن ہر ایک بات میں ہر فعل راستبازی کو پرکھنا اور بات ہے اور یہ اور افراد و جماعتوں کی روحانی نجات ان اخلاقی عادات کی اصلاح پر موقوف ہے۔

اسی لحاظ سے ایمان وہی اصول ہے جسے ظنِ غالب کا اصول کہتے ہیں اور جس کے مطابق روزمرہ ہم اپنا کاروبار کرتے ہیں۔ آجکل لوگوں نے اخلاق عمل کے اس خاص اصول کو نظر انداز اور ساتھ ہی ظنِ غالب کے اصول کو بھی نظرِ حقارت سے دیکھنے لگ گئے۔ بشپ بٹلر صاحب کی دلیل پر یہ بڑا اعتراض کیا گیا ہے کہ انہوں نے ظنِ غالب کے اصول پر بہت زور دیا ہے۔ معترض کہتے ہیں کہ ایسے دینی اہم امور میں محض ظن پر تکیہ کرنا غیر کتفی ہے۔ مگر مخفی نہ رہے کہ دنیاوی اہم امور میں اسی ظنِ غالب کے اصول

پر اکثر فیصلہ ہوتا ہے۔ مُدبّر ملک ایک نازک وقت میں اپنی حکمت
عملی کے بارے میں کُلّی یقین نہ رکھتا ہو اور شائد قطعی فیصلے میں مہینے صرف
ہو جائیں۔ لیکن جب اُس نے فیصلہ کر لیا ہے اگر وہ دانا شخص ہے تو
سارے زور سے اُس کو انجام تک پہنچانے کی کوشش کریگا۔ جن معاملات
کا نتیجہ شائد جلد ظہور میں آنے والا نہیں دانا شخص شائد مدت تک توقف کرے
اور ادنٰے درجے کے ظن پر فیصلہ نہ کرے اور فیصلہ کرنے کے بعد بھی بڑی احتیاط
اور ہوشیاری سے کام کرے۔ لیکن ایک فیصلہ تو کرنا چاہئے اس سے تو
گریز نہیں کر سکتے اور جب فیصلہ ہو گیا تو فوراً اُس پر عمل کرنا ضرور ہوگا۔ کبھی
کبھی کسی دوست یا بچے کے بارے میں دخل دینا پڑتا اور کچھ کرنا پڑتا ہے
اور شائد یہ بہت مشکل بات بھی ہو اور دوستوں سے صلاح مشورت لینا درکار
ہو کہ اُسے کیا کرنا چاہئے لیکن اُسے جلد فیصلہ کرنا ہوگا اور جب فیصلہ ہو گیا
تو اُس کا فرض ہے کہ بلا تامّل اس پر عمل کرے۔ ہماری اخلاقی ذمہ داری
کی اغراض کے لئے بٹلر صاحب کی دلیل بہت مضبوط ہے کہ "ظنِ غالب
ہمارے لئے زندگی کا رہبر ہے"۔

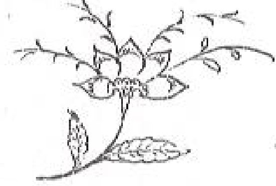
لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اکثر لوگ نئے دین کی صداقت یا اخلاق کی نئی
شریعت کے دعاوی کے بارے میں جو شہادت تائید یا تردید میں ہے
اُس کا پورا موازنہ نہ کر سکیں۔ اگر اور رکاوٹ نہ ہو تو یہ رکاوٹ تو ضرور ہے کہ
ہر ایک کو ایسا موازنہ کرنے کی فرصت کہاں ہے۔ اُن کو اتنا وقت اور
طاقت کہاں سے ملے کہ معمولی کاروبار کو چھوڑ کر سائنس کے مطابق مختلف
مذاہب کا مقابلہ کریں۔ یہ مشکل انسانی ذات کی اِس صفت سے رفع ہو جاتی
ہے جسے مقدس نوشتے ایک قانون ٹھیراتے ہیں کہ روحانی اور اخلاقی امور

ہیں وہ اُن پر بھروسہ رکھیں؛ اور اُن کی پیروی کریں جو انہیں قدرتی پیشوا
معلوم ہوتے ہیں اور جہاں تک اُن کے ذریعے سے محبت ایمان اور
اُمید دلوں میں پیدا ہوتی ہے اُسی کے مطابق وہ اُن کے ساتھ لگے
رہیں۔ یہی صفت زندگی کی حقیقی آگ کو مشتعل کر دیتی ہے جو ایک سے
دوسرے تک بھڑکتی چلی جاتی ہے اور پشت در پشت لوگوں کی ترقی
کا باعث ہوتی ہے جو مضبوط سچے روشن ضمیر اور پاک دل لوگ ہوتے
ہیں اُن پر کمزور لوگ بھروسہ رکھتے ہیں۔ جو شک میں ہیں وہ ایمان
لاتے ہیں اور گنہگاروں کے دلوں میں اُمید پیدا ہو جاتی ہے۔ دیکھنے
سے پیشتر ایمان لاتے ہیں اور یقین سے پیشتر عمل کرتے ہیں۔ پہلے پہل
جب لوگ مسیحی ہوئے تو اسی شخصی تاثیر اور ظنِ غالب کے اصول کے
مطابق ہوئے اور مخالفوں کا یہ طعنہ درست ہے کہ لوگ فلسفے کے اصول
کے مطابق شہادتوں کا مقابلہ اور موازنہ کر کے مسیحی نہیں بنے۔ لیکن آدمی
کے دل میں ایک اور شہادت اور قانون ہے سو اس دلی شہادت اور
قانون نے انہیں مسیحی ہونے پر ترغیب دی اور مجبور کیا۔ ایمان اُمید
محبت صرف تین صفات ہی نہیں بلکہ وہ انسانی فطرت کے خاصے
ہیں۔

پس جب ہم سے یہ طلب کیا جاتا ہے کہ جب تک سائنس کے
مطابق کسی عقیدے کو پرکھ نہ لیں اُس کو قبول نہ کرینگے۔ تو ہم سے
یہ طلب کیا جاتا ہے کہ جس طریقے سے نوعِ انسان نے اخلاقی اور روحانی
ترقی کی ہے اُس کو ترک کر دیں۔ تواریخ سے ظاہر ہے کہ جس قدر
مسیحی کلیسیا نے اخلاق کے معیار اور عمل کو ترقی دی اُس قدر کسی اور

طریقہ سے نہیں ہوئی۔ دیگر مذاہب میں بھی کم و بیش ایمان کی یہ تاثیر نظر آتی ہے۔ لیکن جو برکتیں ہمیں اپنے مذہب کے ذریعے ملی ہیں اُن میں کچھ کلام نہیں۔ پس میں پوچھتا ہوں کہ جس طریقے سے ایسی بڑی ترقی ہوئی ہے اُس کو بالکل غلط کہنا عقل کی بات نہیں۔ معترضوں کا مطالبہ یہ ہے کہ نوع انسان کے ان بزرگوں کی باتوں اور خیالوں کو ہم ترک کر دیں۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ کولمبس ایمان کی ایک مثال ہے۔ جس طرح کولمبس دور دراز سمندروں کا سفر کر کے نئے جزیروں اور ملکوں کو گیا ویسا ہی ہمیں اُس نجات کے پیشوا کے جھنڈے تلے ابدی ملک کی تلاش میں جانا ہے۔ اور اس کام کے لئے ہم اپنے پیشوا کو پیار کرتے اور اُس پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ اس زندگی کی لڑائی میں نہ کتب خانہ میں، وہی کامیاب ہوتے ہیں جو اپنے پیشواؤں کو جانتے اور اُن کی پیروی کرتے ہیں۔

اس لئے اخلاقی سند مکاشفے کی چاہئے نہ علمی۔ ایسی علمی شہادت صرف تجربے سے ہو سکتی ہے اور تجربہ صرف اسی صورت سے ہو سکتا ہے کہ ہم ایمان لا کر فرمانبرداری کریں۔ بقول آگستین اگر ہم سمجھنا چاہتے ہیں تو ہم ایمان لائیں اور دیکھنے سے پیشتر ایمان ہونا چاہئے۔ یہی اِن لکچروں کا مقصد ہے کہ مسیح اور اُن کے رسولوں نے جو دعاوی کئے ہیں ہماری تمیز اُن کی تصدیق کرتی ہے۔



لکچر دوم

تمیز (کانشنس) مشخص[1] خدا پر شاہد ہے

"اے خداوند تو مجھے جانچتا اور پہچانتا ہے"۔ (زبور ۱۳۹: ۱)

پہلے لکچر میں یہ ذکر ہوا کہ مسیحی دین کے اصول کا ثبوت سائنس کے مطابق طلب کرنا درست نہیں بلکہ دینی زندگی اور راستبازی کا قانون وہی ہے جو پولوس نے بتایا ہے کہ "خدا کی راستبازی ایمان سے ایمان تک ظاہر ہوتی ہے"۔ اس قانون کو دوسرے الفاظ میں یوں بیان کر سکتے ہیں کہ نوع انسان کی اخلاقی دینی زندگی کی ترقی یوں ہوتی ہے کہ ہمارے ہمجنسوں میں سے جو بڑے عاقل اور فاضل ہیں اُن پر بھروسہ رکھیں انہیں پیار کریں اور بتدریج اعلےٰ زندگی تک ترقی کرتے جائیں۔ ایمان بھی درحقیقت ایسے ناصح اور ہادی کی طرف اشارہ کرتا ہے جو مقدسوں اور نبیوں سے کہیں زیادہ بھروسہ کے قابل ہے۔ اگر اخلاقی دینی اصول کا علمی ثبوت درکار ہے تو پہلے ان پر ایمان لا کر عمل کرنا چاہئے۔

اس بیان سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہمارے عقیدے کی تصدیق میں کوئی شہادت تجربے سے مل نہیں سکتی۔ بلکہ عقیدے کی بنیاد تو تجربۂ انسانی پر ہونی چاہئے ورنہ اُس پر عمارت قائم نہیں رہ سکتی۔ اور یہ معقول معلوم

[1] مشخص یعنی شخصیت رکھنے والا۔ جو انگریزی لفظ پرسنیل کا ترجمہ کیا گیا ہے۔

ہوتا ہے کہ نبیوں اور رسولوں نے ہماری نسبت زیادہ دیکھا سوچا اور سمجھا۔
لیکن اگر اُن کی تعلیم کی بنا ہمارے کانشنس میں نہ ہوتی اور نہ ہی ہمارے
تجربے سے اس کی تصدیق نہ ہوتی تو اس کا ماننا نادانی ہوتی۔ مثلاً اگر میں
کہوں کہ جانتا ہیں فلاں شخص کو جانتا ہوں۔ تاہم اُس کا گہرا قریبی دوست
نہیں جانتا تو یہ غلط ہوگا۔ لیکن اگر وہ دوست اُس شخص کی نسبت ایسی خبر
دے جو میرے تجربے کے خلاف ہو جو مجھے اُس شخص کے بارے میں
ہے تو میں اُس خبر کو نہ مانوں گا۔ دینی ایمان تجربے اور بھروسے کا مجموعہ
ہے۔ اس لئے ہم اپنے اصولوں کا کچھ علمی ثبوت دینگے۔

ہم اپنے عقیدے کو اس بات سے محدود نہیں کرتے کہ جو سائنس
سے ثابت نہ ہو ہم اُس کو نہ مانیں گے۔ پھر بھی ہم یہ ظاہر کرسکتے ہیں کہ
ہمارے دینی اصول انسانی تمیز اور عقل کی شہادت کے مطابق ہیں۔

پس پہلے ہم یہ دریافت کریں کہ مشخص خدا کی ہستی کو شہادت اور تجربہ
سے کافی طور پر ثابت کرسکتے ہیں یا نہیں۔ یہ ایسا ضروری مسئلہ ہے کہ اس
کے لئے ایک صاف یعنی مجرب ثبوت کی تمنا دل میں ہے۔ البتہ محض
منطقی اور قیاسی دلیلوں پر بہت بھروسہ نہیں رکھ سکتے۔ کیونکہ انسان
کی عقل پر خواہ کیسی ہی تربیت یافتہ ہو ایسی باتوں میں پورا اعتماد نہیں کرسکتی
جو اُس کی رسائی سے پرے ہیں بلکہ امور واقعی سے اُس کو پرکھنا چاہیئے۔
امور واقعات سے قطع نظر کرکے خیالی ثبوت پر لوگوں کو مدعو کرنا بیہودہ بات
ہے۔ اگر دین کا تعلق صرف فلسفیوں ہی سے ہوتا ہے اور عام آدمیوں
سے صرف یہی کہا جاتا ہے کہ فلسفیوں کی ہدایت پر تکیہ کرو تو شاید مشخص خدا
کے ثبوت کے لئے اُسی قسم کی دلائل کافی ہوتیں جو علت اولےٰ کے

ثابت کرنے کے لئے پیش کی جاتی ہیں۔ لیکن تواریخ پر نظر ڈالنے سے
یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسی دلائل مددگار تو ہیں لیکن ایمان کا وسیلہ نہیں۔
خود ایک بڑے معترض (میتھو آرنلڈ) نے یہ کہا کہ بنی اسرائیل نے یہ
دینی تصورات منطقی دلائل سے حاصل نہیں کئے تھے۔ اس عقیدے کے
عملی ہونے کے لئے یہ ضرور تھا کہ اس کی بنیاد نہ منطقی علمی دلائل پر بلکہ ایمان
سے اعلےٰ دلیل پر ڈالی جائے۔ گو اس قسم کے دلائل مسیحی عقیدے کی عقلی
تصدیق کے لئے بہت مفید ہوں لیکن ان لکچروں کے عملی مقاصد کے
لئے چنداں ضرور نہیں۔ شاید اُن سے مشخص علت اولےٰ کا ثبوت ملے۔
لیکن اگر ہم یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا انجیل کی مطابقت انسان کی
اخلاقی ذات سے ہے تو ہمیں یہ دریافت کرنا چاہیئے کہ اُس الٰہی شخص کی
سیرت کیسی ہے۔ ہم کو محض اس کی شہادت درکار نہیں کہ کوئی ایسا وجود
ہے بلکہ یہ کہ ہماری اخلاقی روحانی ذات کا اُس سے تعلق ہے۔ اس کے بارے
میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس کی تصدیق ہماری طاقت سے باہر ہے۔ ہم
مشاہدہ اور شخصی تجربے کے ذریعے یہ دریافت کرسکتے ہیں کہ ہم سے علیحدہ ایک
ازلی طاقت جہان میں ہے۔ جو راستبازی کی حمایت کرتی ہے۔ اس طاقت
کا مشخص ہونا اور اُس کے مشخص ماننے پر ہی ہماری بہبودی ہونا (معترضوں
کے خیال میں) فرضی بے ثبوت باتیں ہیں۔ اس لئے جان سٹوارٹ مل
صاحب کہتے ہیں کہ تمیز (کانشنس) سے خدا کے بارے میں دلیل لانا
چنداں وقعت نہیں رکھتا۔ اور وہ مصنف صرف دلیل تجویزی[۱] کو علمی دلیل
ہونے کا رتبہ دیتا ہے۔ یہ صاحب ایمان کو ایک جائز اُمید ٹھہراتا ہے
جس کا اخلاقی طور پر بہت بڑا درجہ نہیں۔ اس لئے ہمیں کوئی اخلاقی شہادت

[۱] یعنی design دلیل جس کا مطلب یہ ہے کہ صنعت سے صانع کا وجود ثابت ہوتا ہے۔

اس کی تائید میں پیش کرنی چاہیئے اگر ہم مقدس نوشتوں کی ہدایت پر چلیں تو ایسی شہادت ملے گی۔ اگر خدا پر ایمان لانے کی حقیقی کیفیت اور تصدیق کہیں ہے تو وہ مقدس نوشتوں میں ملے گی۔ اب ہم دریافت کریں کہ کس بات نے اس ایمان کو عبرانیوں کے دل پر یہ غلبہ بخشا؟

سب لوگ اس پر متفق ہیں کہ اوروں کی نسبت بنی اسرائیل کو راستبازی کی پہچان زیادہ تھی اور اس کا حق زیادہ سمجھتے تھے۔ کل انسانی زندگی میں انہوں نے خدا کے فضل سے یہ معلوم کر لیا کہ ایک مستقل بے تبدیل زبردست راستباز قوت کام کر رہی ہے۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ اس یقین کے ساتھ ساتھ انہیں خدا کی شخصیت کا تصور بھی حاصل تھا اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ دونوں خیال آپس میں لازم ملزوم ہیں۔ جس راستباز تاثیر کو اہل اسرائیل نے پہچانا اگر اس کی حقیقت کو دریافت کریں تو یہ تعلق دونوں تصوروں کا زیادہ زیادہ ظاہر ہوتا جائے گا۔

اس تاثیر کی نسبت یہ کہنا کہ وہ محض ایک قانون یا ایک قوت ہے بالکل غیر مکتفی ہوگا۔ قانون یا قدرت کی نسبت یہ زیادہ نزدیک زیادہ عملی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں نوع انسان کا تجربہ کچھ موہوم سا ہے اس قسم کی شہادت سے زیادہ پریشانی پیدا ہوتی اور بہت یقین حاصل نہیں ہوتا۔ انبیا جن کا ایسا پختہ ایمان تھا زمانے کی تمام رفتار کو دیکھ کر ایسے حیران تھے کہ ان میں سے بعض یہ چلا اٹھے "شریعت ڈھیلی ہوگئی اور عدالت جاتی رہی ہے"۔ قانون سے ایسی بڑی بڑی مستثنیات کا ذکر آیا ہے کہ علمی (سائنٹفک) تصدیق مشتبہ ہو جاتی ہے۔ ایوب کی کتاب میں اس قسم کے مشاہدے کی قدیم شہادت پائی جاتی ہے۔

اور اس کتاب میں یہ امر تسلیم کیا گیا کہ راستبازی کے دعاوی اور امور زندگی کے درمیان جو رشتہ ہے اس میں لاینحل بھید پائے جاتے ہیں اور ایوب جیسے راستباز شخص کا ایمان اسی لئے قائم رہا کہ اس نے اپنی نادانی کا اقرار کیا۔ لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ ابتدائی زمانوں میں عوام الناس کے لئے ایمان کا یہ چشمہ ہو۔ یہودیوں میں جو یقین راستبازی کے بارے میں تھا وہ زیادہ قرین قیاس ہے۔ جس امر نے یہودیوں کے دلوں پر اثر کیا وہ محض قانون یا میلان طبیعت نہ تھا۔ بلکہ یہ وہ تاثیر تھی جس نے ہر فرد میں راستبازی کی اور اس کی فوقیت کا دعویٰ جتایا۔ انہوں نے نہ صرف یہ سمجھا کہ جہان میں راستبازی سب سے بڑھ کر اختیار رکھتی ہے بلکہ ہر ایک کے دل میں یہ سب سے بڑھکر اختیار رکھتی ہے۔ حق اور ناحق کی پہچان (اس پر ہم غور کر رہے ہیں) ان کی تمیزوں میں حقیقی نقشہ جمائے تھی۔ اور انہوں نے اپنے دلوں میں یہ بھی معلوم کیا کہ کوئی ایسی قدرت برابر تاثیر کر رہی ہے جس سے حق کو مدد ملتی ہے اور ناحق کو شکست ملتی ہے۔ اس تصور کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ یہ کانشنس کی بات ہے جس کی تصدیق ہر شخص اپنے دل میں کر سکتا ہے۔ اگر اس شخصی تصدیق سے شخص خدا پر ایمان لانے کی ضرورت ظاہر ہوتی ہے تو اس قسم کی شہادت ہر آدمی کے دل کو لگتی ہے۔

اس دلی شہادت کا اظہار اسی مزمور میں پایا جاتا ہے جس میں سے ایک آیت لیکچر کے شروع میں لی گئی وہاں لکھا ہے کہ "اے خداوند تو مجھے جانچتا اور پہچانتا ہے تو میرا اٹھنا اور میرا بیٹھنا جانتا ہے تو میرے اندیشے کو دور سے دریافت کرتا ہے تو میرا چلنا اور میرا لیٹنا خوب جانتا ہے بلکہ تو میری ساری روشوں سے واقف ہے کہ دیکھ میری زبان پر کوئی ایسی بات

نہیں کہ جس سے تو اے خداوند بالکل آگاہ نہیں تو آگے پیچھے میرا گھیرنے والا ہے اور تو نے اپنا ہاتھ مجھ پر رکھا ہے"۔ بھلا کیونکر داؤد نے محسوس کیا کہ وہ چاروں طرف سے گھیرے ہے۔ اُس کی ذات میں یہ کونسی قوت ہے جس نے اس حضوری کو ایسے صاف طور سے محسوس کیا۔ اس مزمور کی آخری آیات میں اُس کا حال کھُلتا ہے۔"اے خدا مجھے جانچ اور میرے دل کو جانچ مجھے آزما اور میرے اندیشوں کو پہچان۔ دیکھ کیا مجھ میں کوئی دردانگیز عادت ہے کہ نہیں اور مجھ کو ابدی راہ میں چلا"۔ روحانی حضوری کا عقلی طور سے جاننا یہاں مذکور نہیں کیونکہ مصنّف مزمور محض ذکر نہیں کرتا کہ خدا ہمہ جا حاضر اور ناظر ہے۔ بلکہ وہ ایسی حضوری کا ذکر کرتا ہے جو اُس کے دل کو جانچ رہی ہے اُس کے خیالوں کی پڑتال کر رہی ہے کہ اُس میں کوئی بُری عادت تو نہیں۔ اس قسم کا عمل گا ہے گا ہے نہیں بلکہ برابر ہو رہا ہے۔ بھٹی کی آگ کی طرح دل تایا جاتا ہے"۔ چاندی کے لئے کٹھالی اور سونے کے لئے آگ کی بھٹی لیکن خداوند دلوں کو آزماتا ہے"۔ آدمی کے دل میں جو یہ حق اور ناحق کی پہچان ہے اس سے وہ بچ نہیں سکتا"۔ تیری روح سے میں کدھر جاؤں تیرے حضور سے میں کہاں بھاگوں اگر میں آسمان کے اوپر چڑھ جاؤں تو تو وہاں ہے اگر میں پاتال میں بستر بچھاؤں تو تو دیکھ وہاں بھی ہے اگر صبح کے پنکھ لے کے میں سمندر کی انتہا میں جا رہوں تو وہاں بھی تیرا ہاتھ مجھے لے چلے گا اور تیرا دہنا ہاتھ سنبھالے گا اگر میں کہوں کہ تاریکی تو مجھے چھپا لے گی تب رات میرے گرد روشنی ہو جائیگی یقیناً تاریکی تیرے سامنے تیرگی نہیں پیدا کرتی پر رات دن کی مانند روشن ہے تاریکی اور روشنی دونوں یکساں ہیں"۔ پس انسان کو سوائے اس کے کیا چارہ

ہے کہ اس حاضر و ناظر قوت کے آگے سر تسلیم خم کرے اُس کی اطاعت کرے اور اُس سے اتحاد پیدا کرے"۔ اے خداوند کیا میں اُن کا کینہ نہیں رکھتا جو تیرا کینہ رکھتے ہیں کیا میں اُن سے جو تیرے مخالف ہو کے اُٹھتے ہیں بیزار نہیں۔ میں شدت سے ان کا کینہ رکھتا ہوں میں اُنہیں اپنے دشمنوں میں گنتا ہوں۔ اے خدا مجھے جانچ اور میرے دل کو جانچ مجھے آزما اور میرے اندیشوں کو پہچان۔ دیکھ کیا مجھ میں کوئی دردانگیز عادت ہے کہ نہیں اور مجھ کو ابدی راہ میں چلا"۔

میں نے اس مزمور کا حوالہ اس لئے نہیں دیا کہ یہ دینی لحاظ سے مستند ہے بلکہ اس لئے کہ اس میں انسان کے دل اور کانشنس کا تجربہ مندرج ہے اور کیا ہم میں سے ہر ایک کا کسی نہ کسی وقت یہی تجربہ نہیں ہوا؟ ممکن ہے کہ کچھ دیر تک کانشنس کند اور مردہ ہو جائے لیکن پھر بھی اس کی حضوری سے کُلیۃً طور پر بچ نہیں سکتا۔ یہ حضوری راہ میں بستر میں گھر میں باہر میں رات کو دن کو آ گھیرتی ہے اس کی ہدایات کو اگر گننے لگو تو ریت کے ذرّوں سے زیادہ نکلے گی۔ شاید لذت کی نیند میں اس کو بھول جاؤ لیکن خواب سے بیدار ہوتے ہی یہ تمہارے ساتھ ہے اس آواز کا کام کیا ہے؟ کیا یہ آواز اس امر پر قناعت کرتی ہے کہ امتیاز شریعت کی عام فوقیت کا اشتہار دے؟ نہیں بلکہ برعکس اس کے یہ دلوں کو جانچتی خیالوں کو پرکھتی ہے تاکہ معلوم کرے کہ ہمارے دل میں کوئی بد عادت تو نہیں۔ ایک عجیب عدل سے ہماری سیرت شخصیت ذمہ داری کمزوری وغیرہ کے مطابق سلوک کرتی ہے۔ جہاں تک ہم نے جان بوجھ کر گناہ کیا ہے وہ ہم کو مجرم ٹھیراتی ہے اور ہر موقع پر حسب ضرورت ڈانٹ

اور آگاہی بخشتی ہے ⁂

اس مزمور سے اتنا تو ظاہر ہے کہ یہودیوں پر کانشنس کی بڑی تاثیر ہوئی۔ اب یہ دریافت کریں کہ جو نتیجہ مزمور نویس نے نکالا وہ کہاں تک درست ہے۔ پہلا نتیجہ تو یہ نکالا کہ یہ بااختیار تاثیر انسان خود نہیں اس سے کسی الگ طاقت کی یہ تاثیر ہے اور وہ طاقت انسان سے بڑھ کر کیونکہ وہ انسان پر حکومت کرتی اور اُس کو ہدایت کرتی ہے۔ یہاں تک تو معترض کو ماننا پڑے گا۔ علاوہ ازیں مزمور نویس نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ جو شے ہر شخص پر فرداً فرداً تاثیر کرتی ہے وہ خود بھی فرد اور شخص ہوگی۔ شاید مزمور نویس کو شخصیت کے معنے معلوم نہ ہوں پر وہ اتنا تو جانتا تھا کہ کانشنس کی تاثیر اُس پر اسی قسم کی ہوتی ہے جیسے ایک شخص کی دوسرے شخص پر۔ یہ تعریف بھی کرتی ہے اور ملامت بھی۔ یہ قانون کی مانند نہیں بلکہ ہر مزاج اختلاف خلقی کمزوری وغیرہ مختلف حالتوں کے مطابق یہ سلوک کرتی ہے۔ الغرض یہ شخصی تاثیر ہے جیسے دل کے مقابل دل اور آدمی کے چہرے کے مقابل آدمی کا چہرہ۔ ویسے ہی یہ طاقت جو کانشنس میں کام کرتی ہے انسان کی ذات کے مقابل ہے ⁂

مزامیر میں خدا کی شخصیت اور راستبازی کے درمیان ایسا ہی تعلق معلوم ہوتا ہے جس تصدیق کنندہ تجربے کا مطالبہ ہم سے کیا جاتا ہے وہ یہاں مل سکتا ہے۔ اس لئے یہ اعتراض درست نہیں کہ شخص خدا کی ہستی کے دلائل طبعی قیاسی یا فوق الفطرت ہیں۔ بلکہ سب سے زبردست دلائل اخلاقی ہیں ⁂

حق اور ناحق کی پہچان مع اس جانچنے والی ذمہ واری کے دیگر صفات

کی نسبت زیادہ انسانی صفات میں عقل کی ساری سوچ و فکر میں ایک طرح کی بے شخصیتی پائی جاتی ہے اور بعض اوقات جس قدر یہ صفت بے شخصیتی کی زیادہ نظر آتی ہے اتنی ہی زیادہ عقل کی خوبی پر دلالت کرتی ہے۔ لیکن حق و ناحق کی پہچان۔ شخصیت یا شخصی ذمہ واری کانشنس کی مقدم صفت ہے۔ اس مشہور دلیل پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے "میں خیال کرتا ہوں اس لئے میں موجود ہوں"۔ اور پھر یہ "چونکہ خدا کا صاف تصور مجھے حاصل ہے اس لئے خدا موجود ہے"۔ اس پہلی دلیل میں بہت زور ہے اس کو بے معنی نہ سمجھنا چاہئے۔ دلیل یہ ہے کہ جب آدمی خیال کرتا ہے تو دو تصور ہوتے ہیں ایک خیال کرنے والا اور دوسرے جس کی نسبت خیال کیا جائے۔ خیال کرنے والا علیحدہ موجود ہے جس کا وہ خیال کرتا ہے وہ علیحدہ موجود ہے۔ اگر اس دلیل کو ان الفاظ میں بیان کریں تو اُس کا زور اور بھی ظاہر ہو۔ "مجھے حق اور ناحق کی پہچان حاصل ہے اس لئے میں ایک فرد ایک شخص وجود ہوں"۔ انسان کے سوا دیگر حیوانات میں کل زندگی اور اُس کے افعال کے لئے متواتر ذمہ واری کا خیال پایا نہیں جاتا۔ لیکن ہر آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ اُس کے سارے افعال مل کر اُس کا شخص منفرد وجود ہے اور کہ وہ ان سارے افعال کے لئے ذمہ وار ہے۔ اس لئے خدا کے عقلی تصور سے دلیل لانے کی نسبت اخلاقی تصور سے دلیل لانا زیادہ پُرزور ہے۔ اس لئے اس دلیل کی بجائے "چونکہ مجھے خدا کا تصور حاصل ہے اس لئے ضرور کوئی وجود اس تصور کے مطابق ہوگا" یہ دلیل لانا زیادہ پختہ ہوگا "میں اپنے دل میں ہر لحظہ یہ محسوس کرتا ہوں کہ ایک راستباز آواز مجھ سے بول رہی ہے اس لئے میں جانتا ہوں کہ ایک راستباز شخص سے میرا واسطہ

ہے +

لوگوں سے اس پہچان کے بارے میں گفتگو کرو تو تم اُن کے ذاتی تجربے کے مطابق گفتگو کرتے ہو اس لئے اُن پر تاثیر ہوگی اور تمہارے پیغام کی تصدیق اس بے تبدیل اور غیر فانی اندرونی علم سے ہو جائیگی۔ اگر اس دلیل پر خدا کی ہستی مانی جائے تو اس سے اُس کی وحدت کا بھی ثبوت ملے گا۔ اگر ہم صرف فطرت پر غور کریں تو دیگر الٰہوں یا دیوتاؤں کے ماننے کی بیہودگی اتنی ظاہر نہیں ہوتی۔ جیسے کانشنس کی مذکورہ بالا آواز پر غور کرنے سے ظاہر ہوتی ہے۔ پھر ہم مل کر یہ کہہ اُٹھتے ہیں۔ "سُن اے اسرائیل۔ خداوند ہمارا خدا ایک خداوند ہے"۔ یہ جو ہزاروں لاکھوں دلوں میں ایک ہی سُر سے بول رہا ہے وہ ضرور ایک ہی ہوگا۔ جو ایک ہی قسم کی کسوٹی سے سب کو پرکھتا ہے اور سب کو ایک ہی سمت کی طرف جانے کی ہدایت کر رہا ہے +

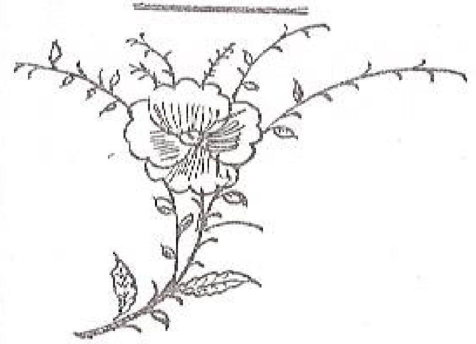
اب ہم یہ کہتے ہیں کہ جو طاقت افراد میں اور جہان میں راستبازی کی تائید کر رہی ہے وہ ضرور راستباز طاقت ہوگی اور جو راستباز طاقت یا ایسی طاقت جو راستبازی پر چلتی ہے وہ کسی نہ کسی معنی میں ایک شخص ہوگی جو ہمارے بارے میں ارادہ محبت اور عقل کو کام میں لا رہی ہے۔ اگر کوئی شخص حق و ناحق کی پہچان کو اور راستباز حکومت کے وجود کو مانے لیکن کہے کہ اس سے اُس حکمران طاقت کی شخصیت ثابت نہیں ہوتی تو ہم صرف یہ کہیں گے کہ اُس راستباز تاثیر کے عمل پر زیادہ غور کرو۔ اور اگر کوئی معترض یہ کہے کہ یہودی لوگوں نے اپنے دلی میلان سے اس طاقت کو جو راستبازی کی تائید کرتی ہے شخص گردانا

تو ہم پھر یہی کہیں گے کہ جس طاقت کا یہودیوں نے بیان کیا ہے اُس کے عمل پر زیادہ غور کرو۔ اگر اس تاثیر کا عام کام یہی سمجھا جائے کہ انسان کی زندگی میں راستبازی کی فوقیت ظاہر کرے تب تو اُسے قانون یا میلان کہنا ناممکن نہ ہوگا۔ پر جب ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ ہمارے دلوں اور تمیزوں اور ہر شخص کے ساتھ برتاؤ کر رہی ہے تب میری رائے میں اس کو شخص کہے بغیر ہم نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ قانون افراد کا لحاظ نہیں کرتا اور نہ اُسے پروا ہے کہ اس سے اُن کو کیا نتیجہ ملے گا لیکن جو طاقت مجھے راستباز بنانے کی کوشش کرتی ہے تو وہ اپنے اثر کو میرے گناہوں میری کمزوریوں میری ضرورتوں کے مطابق صورت دے گی یعنی راستبازی سے میرے ساتھ سلوک کرے گی +

ایک اور مثال اس بات کی لیجئے کہ بنی اسرائیل نے اس طاقت کو کس طرح پہچانا۔ "اے خداوند گہراؤں میں سے میں تیرے آگے چلایا۔ اے خداوند میری آواز سُن۔ تیرے کان میری دعاؤں کی آواز پر لگے رہیں۔ اے خداوند اگر تو بدی کا حساب لے تو کون کھڑا رہ سکتا ہے۔ لیکن تیرے پاس تو معافی ہے تاکہ لوگ تیرا ڈر رکھیں"۔ ۱۳۰ مزمور کی طرح یہ بھی دلی تجربے کی آواز ہے۔ جہاں یہ آواز دل کو گناہ سے قائل کرتی ہے وہاں معافی کی ضرورت اور امکان کو بھی ظاہر کر دیتی ہے۔ لیکن قانون میں معافی کی گنجائش نہیں۔ جب کوئی شخص نیکی سے ہٹ جاتا ہے تو اس کا عام طریقہ یہ ہے کہ اُس کے ہم جنس اُس کو ملامت کرتے اور کچھ حوصلہ دیتے ہیں۔ سزا کی دھمکی اور معافی کی اُمید دلاتے ہیں۔ اس طرح سے وہ شخص بدی سے اکثر ہٹ جاتا ہے۔ اگر کوئی ایسے شخص کو

کامل راستباز بنانا چاہے تو اس شخص کی توبہ اور نئی پیدائش کامل ہونی چاہئے اور اُس کے ہم جنسوں کی کامل تاثیر ہونی چاہئے اس سے ظاہر ہے کہ ایک روحانی راستباز شخص کی ضرورت ہے رُوح کی صحت کے لئے +

المختصر ہم کانشنس کو ایک چھٹی حس کہہ سکتے ہیں جس کے ذریعے خدا پہچانا جاتا ہے - یہ اور بات ہے کہ ہم اُس کو عقلی طور پر کیسا بیان کریں - خدا کی یہ اخلاقی پہچان اس کی دیگر صفات کے مطابق ہے جن کو ہم مانتے ہیں - لیکن جب ہم سے مجرب ثبوت طلب کیا جائے تو ہم اس دلیل کو پیش کریں کہ ایک الٰہی روحانی شخص موجود ہے جو راستبازی اور عقل سے اپنا کام چلاتا ہے - یاد رکھئے یہ قطعی ثبوت نہیں - لیکن ایسی شہادت ہے جس کی تصدیق ہر شخص کر سکتا ہے +



تیسرا لکچر

"میں تیری ستائش کرتا رہوں گا کیونکہ میں دہشت ناک طور سے عجیب و غریب بنا ہوں تیرے کام حیرت افزا ہیں اس کا میرے جی کو بڑا یقین" (زبور ۱۳۹ : ۱۴) +

گزشتہ لکچر میں اس بات کا ذکر کیا کہ انسانی ذات کا تجربہ شخص خدا پر ایمان لانے کی تائید کرتا ہے - ہم محض ظن غالب اور منطقی دلائل ہی پر بھروسہ نہیں کرتے بلکہ ایسی دلیل کی طرف توجہ دلاتے ہیں جس کی تصدیق ہر شخص اپنے دل میں کر سکتا ہے اور دوسروں پر اس کو ظاہر کر سکتا ہے - یہ مسیحی دین کا دعویٰ ہے اور مسیح سے پیشتر انبیا کا بھی یہی دعویٰ تھا کہ نہ صرف ہم خدا کی ہستی پر ایمان لائیں بلکہ اُسے سارے دل و جان عقل اور طاقت سے پیار کریں - زیادہ دانا جیسے اُس شخص کو پیار کرتے ہیں جو سب سے زیادہ دانا اور پاک ہے - یہ مطالبہ نہ صرف عقلمندوں سے کیا جاتا ہے بلکہ سیدھے سادے اور ناخواندہ لوگوں سے بھی یسعیاہ نبی نے کہا "سُنو اے آسمانو اور کان لگاؤ اے زمین کہ خداوند یوں فرماتا ہے کہ لڑکوں کو میں نے پالا اور پوسا پر اُنہوں نے مجھ سے سرکشی کی بیل اپنے مالک کو پہچانتا ہے اور گدہا اپنے صاحب کی چرنی کو بنی اسرائیل

نہیں جانتے میرے لوگ کچھ نہیں سوچتے ہیں" ایسا ہی پولوس رسول کا بیان ہے "اس لئے اُس کی صفتیں جو دیکھنے میں نہیں آتیں یعنی اُس کی ازلی قدرت اور خدائی دنیا کی پیدائش کے وقت سے خلقت کی چیزوں پر غور کرنے میں ایسی صاف معلوم ہوتی ہیں کہ ان کو کچھ عذر نہیں" اگر اس عبارت کی تصدیق چاہیئے اگر یہ شخص خدا پر ایمان لانے پر دلالت کرتی ہے تو اس کی بنیاد ضرور انسانی ذات کے نہایت عام اور گہرے تجربہ میں ڈھونڈھنی چاہیئے۔ ایسے ایمان کے بارہ میں اگر تواریخ میں تلاش کریں تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ دلائل عقلی سے ایسا ایمان پیدا ہوا کیونکہ نادان لوگوں میں بھی یہ ایمان پیدا ہو جاتا ہے اور یہ مرض متعدی کی طرح ایک سے دوسرے تک پہنچتا ہے نہ دوسروں کی عقلوں کو قائل کرنے سے۔ البتہ اس کے صحیح ہونے کے لئے عقلی منطقی دلائل ضرور ہیں لیکن ہمارے مقصد کے لئے ایسی دلائل کی طرف جانا ضرور نہیں +

یہ بھی ہم نے ذکر کیا تھا کہ مزمور ۱۳۹ میں تجربہ کا ذکر ہے اور وہ تجربہ عقل کو مخاطب نہیں کرتا بلکہ کانشنس کو اگر اس خطاب کے زور کا اندازہ لگانا ہو تو ہم اپنے دل سے یہ سوال کریں کہ کیا یہ تصویر اسی قدرت کی نہیں جو نہ صرف جہان میں راستبازی کی حمایت کرتی ہے اور بدی کو سزا دیتی ہے بلکہ ہم میں سے ہر ایک کے کانشنس پر محیط ہے جو ہمارا اُٹھنا بیٹھنا جانتی ہے اور ہماری ساری راہوں سے واقف ہے۔ قانون کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ یا تو اس کی اطاعت کریں یا سزا اُٹھائیں اس لئے یہ قدرت محض قانون نہیں ہے۔ بلکہ اس کا برتاؤ ہمارے ساتھ ایسا ہے جیسے ایک شخص دوسرے سے کرتا ہے حالت مزاج۔ قصور۔ کمزوری

عمداور سہو کا لحاظ کرتا ہے۔ الغرض یہ قوت ہماری شخصیت کی تائید ہے یا کم سے کم ہمارے ساتھ برتاؤ کے لحاظ سے یہ شخص ہے۔ چونکہ یہ راستبازی سے ہمارے ساتھ سلوک کرتی ہے اس لئے اسے ہم راستباز تاثیر کہے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور چونکہ یہ ہمارے شخص ارادوں پر تاثیر کرتی ہے اس لئے ہم اُسے اس لحاظ سے شخص راستباز ارادہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس لئے یہ دلیل اس دلیل سے زیادہ پُرزور ہے کہ قانون قانون دہندہ پر دلالت کرتا ہے اس لئے کانشنس کا یہ دعویٰ اُس پر دلالت کرتا ہے حکومت کرنا جس کا حق ہے۔ یہ محض نتیجہ نہیں بلکہ نتیجہ سے زیادہ ہے کیونکہ ہر شخص معلوم کرتا ہے کہ کوئی اخلاقی ارادہ اُس کے ارادہ پر اثر کر رہا ہے۔ اس کی تصدیق بیان کرنے پر موقوف نہیں بلکہ خود محسوس کرنے پر موقوف ہے +

ایسے تجربوں پر راستباز شخص خدا پر ایمان لانا مبنی ہے اور یہی تجربہ مزمور نویس کا تھا۔ مقدس نوشتوں پر غور کرنے سے ایک اور بات بھی معلوم ہوتی ہے جس کا ذکر عنوان لکچر میں ہوا ہے۔ پہلے تو ہمیں یہ تصور حاصل کرنا ہے کہ یہ راستباز شخص وجود ہمارا خالق ہے اور بائبل میں خدا کی قدرت حکمت محبت کا جو خط بیان ہوا ہے اس کی تصدیق شخصی تجربہ سے ہونی چاہیئے۔ شاید کوئی کہے کہ کانشنس کی آواز تو ایک راستباز شخص کی حضوری کا ذکر کرتی ہے لیکن اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ اُسی کی آواز ہے جس کے نقش قدم فطرت میں نظر آتے ہیں۔ اس کا جواب بھی کانشنس سے ملتا ہے۔ زیر بحث مزمور میں یہ بھی ذکر ہے کہ یہ طاقت انسان کے سارے ڈھانچے بدن اور روح کو بھی جانتا

نہ ہو۔ اور آدمی اخلاقی مقصد کے لئے اپنی فطرت کے ادنیٰ اجزا کو کشتہ
کرے۔ یہی حال نوع انسان کی عام بہبودی کا ہے اور عام تجربہ ہماری
ہدایت کرتا ہے۔ لیکن بعض صورتوں پر یہ بیان صادق نہ آئے گا۔
جیسا میں نے پہلے لکچر میں ذکر کیا جب مسیحی اخلاق کا شروع ہوا تو بیشتر
صورتوں میں فرض کی حس نتیجہ کے تجربہ سے پیشتر پائی گئی۔ انجیل کی
منادی نے کانشنس کو روشن کیا اور کانشنس نے ایک شریعت کی اطاعت
کے لئے ہدایت کی اور وہ شریعت آج زندگی کا اعلیٰ رہنما ہے۔ فرض
کی یہ حس اسی طرح سے پیدا ہوتی اور قائم رہتی جیسا مزمور نویس نے
ذکر کیا ہے "میرے گردے تیرے قبضہ میں ہیں"۔ تجھے یہ قدرت اور
حق حاصل ہے کہ مجھے خاص مقاصد اور کاموں کے لئے خلق کرے اور
میرا فرض ہے کہ ان مقاصد کو پورا کروں اور ان کاموں کو بجا لاؤں کیونکہ
انہیں کے لئے میں عجیب و غریب بنا ہوں۔ "میں تیری ستائش کرتا
رہوں گا کیونکہ میں وہشتناک طور سے عجیب و غریب بنا ہوں تیرے
کام حیرت افزا ہیں اس کا میرے جی کو بڑا یقین ہے"۔ آدمی اچھی طرح سے
جانتا ہے کہ جو طاقت حکومت کا حق جتاتی ہے جو اُسے آگے پیچھے گھیرے
ہوئے ہے وہ ضرور وہی طاقت ہوگی جس کی کتاب میں اور جس کی
حکمت میں اُس کے سارے اعضا تحریر کیے گئے اور ان کے دنوں
کا حال بھی جب ہنوز اُن میں سے کوئی بنا نہ تھا ×

بیان مذکورۂ بالا بہت صاف ہے اور جس تجربہ کا بیان اس مزمور
میں ہوا ہے اس کے مطابق ہم لوگوں کو قائل کر سکتے ہیں اس دلیل
میں دلیل تجویز بھی شامل ہے اس لئے یہ دلیل زیادہ پُرزور ہے۔ اور

دلیل تجویز کو مِل صاحب علمی یا سائنٹفک دلیل مان چکے ہیں۔ کیونکہ وہ تسلیم
کرتے ہیں کہ اس کا زیادہ ظن غالب ہے کہ یہ جہان کسی عقل کا بنایا ہوا ہے۔
محض طبعی پہلو سے یہ امر مِل صاحب نے تسلیم کیا ہے اور جب اخلاقی
پہلو سے اس پر نظر کی جائے گی تو اس دلیل کا زور بہت بڑھ جائے گا۔
مِل صاحب نے آنکھ کی مثال لی ہے۔ آنکھ کے اجزا اور اُن اجزا کی
ترتیب ایسی ہے کہ اُس سے حیوان کو دیکھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔
چونکہ یہ اجزا ایسی حالت میں ہیں اس لئے حیوان دیکھتا ہے۔ اگر یہ اجزا
ایسے نہ ہوتے اور نہ ایسی ترکیب سے ہوتے تو حیوان نہ دیکھ سکتا یا کم
سے کم اس قدر نہ دیکھ سکتا جیسے وہ اب دیکھ سکتا ہے۔ پس یہ ماننا پڑتا
ہے کہ آنکھ کی ساخت کی علت غائی یہی تھی کہ حیوان دیکھ سکے۔ اس
لئے وہ ساخت ضرور کسی ذی عقل ارادہ سے صادر ہوئی ہوگی ×

اس دلیل کے زور کے مقابلہ میں یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ اجسام
کا نشو و نما خواہ وہ اجسام کیسے ہی پیچیدہ ہوں اس قانون کی بتدریج تاثیر سے
ہوتا رہتا ہے کہ جو زیادہ لائق ہے وہ بچ جائے۔ اس لئے زندگی کے
لئے جو جد و جہد حیوانات میں ہوتا ہے اس کا یہ نتیجہ ہے کہ ہزارہا حیوانات
میں سے جو سب سے زیادہ مفید ہیں وہ بچ رہتے ہیں۔ مِل صاحب کہتے
ہیں کہ یہ تشریح آنکھ کی ساخت پر مشکل سے عائد ہو سکتی ہے پس جب
بدن کا لحاظ اخلاقی طور پر کیا جائے تو یہ مشکل بڑھ کر درجہ محال تک پہنچ
جائے گی ×

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ انسانی بدن کی ساخت کا اکیلا یہی مقصد
نہیں کہ چند طبعی بدنی نتائج پیدا کرے جیسے دیکھنا سننا وغیرہ بلکہ یہ بھی

کہ خاص اخلاقی نتائج اعلےٰ درجہ کے پیدا کرے ۔ نہایت اعلےٰ و افضل
واقدس خیالات میاں بیوی اور والدین واولاد کے رشتوں سے پیدا
ہوتے ہیں حالانکہ ان کا لازمی تعلق انسانی ذات کی بدنی ساخت کے ساتھ
ہے ۔ ان رشتوں کے فرائض کو کون عقل کا دشمن کہے گا کہ محض طبعی اور
جسمانی ہیں ۔ ان کا گہرا تعلق انسان کی رُوح کے ساتھ ہے ۔ محبت انہیں
رشتوں سے پیدا ہوتی ہے ۔ جس قدر لوگوں نے ان رشتوں کو وفاداری سے
ادا کیا ہے اسی قدر نسلاً بعد نسلاً نئے آسمان و نئی زمین آدمی پر منکشف
ہوئے ہیں ان اخلاقی قوانین پر انسان کی محض دنیاوی بہبودی موقوف
نہیں اور نہ محض تمدنی ۔ ہمارے گھروں کی برکت ہمارے دلوں کی
پاکیزگی ہماری محبت کی صفائی الغرض ہماری زندگی کی سب سے اعلےٰ خوبی
انہیں اخلاقی قوانین پر مبنی ہے ۔ پس انسانی ذات کی ساخت کا مقصد
مثلاً نر و مادہ کے رشتہ کے بارہ میں آنکھ کی ساخت کی طرح محض طبعی
اور بدنی نہیں بلکہ اخلاقی بھی ہے ۔ یہ ساخت ایسی ہے جس سے اعلےٰ
روحانی خوبیاں سرزد ہو سکتی ہیں ۔ اور بلا ان کے اس ساخت کا کافی
نشوونما اور مناسب استعمال ہو نہیں سکتا ۔ پس اگر یہ دلیل درست ہو کہ
جب یہ طبعی بدن طبعی مقصد کے لئے بنے ہیں اس لئے یہ ذوی عقل
ارادہ کی ساخت ہیں تو یہ دلیل بھی درست ہوگی کہ چونکہ یہ طبعی بدن
اخلاقی مقصد کے لئے بنے ہیں اس لئے وہ اخلاقی ارادہ کی ساخت
ہیں ۔ تواریخ اور تجربہ سے یہ ظاہر ہے کہ انسان کی طبعی ذات کا اعلےٰ
کمال اس کی اخلاقی ذات کے کمال کے بغیر نہیں ہو سکتا ۔ جوں جوں یہ
مطلب بخوبی ظاہر ہوتی ہے اخلاقی تجویز کی دلیل زیادہ پر زور ہوتی جاتی

ہے ۔ جہاں تک انسانی ذات کا تعلق ہے اس جملہ کا مصداق ہے ۔
"خداوند اپنی ساری راہوں میں راستباز ہے اور اپنی ساری صفتوں میں
پاک ہے" یعنی ایسی عجیب و غریب اور دہشت ناک ساخت انسان کی
ساری راہوں میں اُس کا راستباز مقصد اور پاک منشا ہے ۔ دلیل تجویز
کا یہ اخلاقی پہلو دوسرے پہلو کو مضبوط کرتا ہے بلکہ دوسرے پر محیط
ہے کیونکہ درحقیقت اخلاقی مقصد عقلی مقصد سے جدا نہیں ہو سکتا
جیسے راستبازی عقل سے جدا نہیں ہو سکتی ۔ اگر انسانی بدن اور نسل
اس امر پر شاہد ہے کہ انہیں ایک اخلاقی ارادہ نے اخلاقی مقصد کے
لئے بنایا تو یہ امر اس میں خود بخود داخل ہے کہ ایک ذی عقل ارادہ نے
عقلی مقصد کے لئے انہیں بنایا ۔ *

آجکل چونکہ طبعیات پر غور و فکر محدود ہے اس لئے ممکن ہے کہ
انسان کی ذات کے اخلاقی پہلو کو آدمی نظرانداز کردے مگر یہ کہنا کہ انسانی ذات
کا نشوونما بلا اس اخلاقی نشوونما کے ہو سکتا ہے سچ نہ ہوگا ۔ کیا پشتوں
کا جدوجہد زندگی قائم رکھنے کے لئے اس لئے تھا کہ یہ بدن کمال تک
پہنچے یا انسان کمال تک پہنچے ۔ جبکہ انسان کے کمالات میں سے
ایک یہ ہے کہ اُسے کبھی کبھی جسمانی اور طبعی امور کو بالکل بالائے طاق
رکھنا پڑتا ہے ۔ سائنس نے یہ امر بخوبی معلوم کرلیا ہے کہ کل فطرت کا
تعلق اس کے ہر جزو سے ہے ۔ خواہ قانونِ طاقت کو لو یا قانون تواتر یا
طبعی انتخاب کے قانون کو لو ۔ یہ سب اس بات پر شاہد ہیں کہ فطرت
کے سارے مختلف اجزا عناصر ۔ قوتیں اور تواریخ خاص اجزا کے
بنانے میں مددگار ہیں ۔ مقدس پولوس کی یہ تمثیل اس پر بخوبی صادق

آتی ہے۔ "بدن میں ایک عضو نہیں بلکہ بہت سے ہیں اگر پاؤں کہے اس لئے کہ میں ہاتھ نہیں ہیں بدن کا نہیں تو کیا وہ اس سبب سے بدن کا نہیں ہے .... خدا نے عضووں میں سے ایک ایک کو بدن میں اپنی مرضی کے موافق رکھا ..... اب بہت سے عضو ہیں لیکن بدن ایک ہے آنکھ ہاتھ سے نہیں کہہ سکتی کہ میں تیری محتاج نہیں اور سر بھی پاؤں سے نہیں کہہ سکتا کہ میں تمہارا محتاج نہیں بلکہ بدن میں وہ عضو جو زیادہ کمزور معلوم ہوتے ہیں بہت ضرور ہیں اور بدن کے ان عضووں کو جنہیں ہم کم شوکت والا جانتے ہیں انہیں کو زیادہ عزت دیتے ہیں اور ہمارے بیڈول عضو بہت خوشنڈول ہوجاتے ہیں ..... خدا نے ان عضووں کو جن کی کمی تھی زیادہ حرمت دے کے بدن کو مرکب کیا "تاکہ بدن میں اختلاف نہ ہو .... اگر ایک عضو کچھ دکھ پاتا ہے تو سارے عضو اس کے ساتھ دکھ پاتے ہیں اگر ایک عضو عزت پاتے تو سارے عضو اس کے ساتھ خوش ہوتے ہیں" +

قانون طاقت و تواتر جس کا آج کل ایسا چرچا ہے اس جملہ میں ظاہر ہے "تاکہ "بدن میں اختلاف نہ ہو" مسیحی عقیدہ کی حمایت اور اس دلیل کے مقاصد کے لئے یہ امر بہت وقعت کے لائق ہے۔ آجکل کے عالم کہتے ہیں کہ ہر کیمیا عنصر خواہ کیسا ہی چھوٹا ہو ہر ستارہ خواہ کتنا ہی دور ہو ہر زمانہ خواہ آج سے کتنا ہی عرصہ گذرا ہو ہر طاقت خواہ کیسی کمزور اور غیر محسوس کیوں نہ ہو مل کر فطرت کے ہر حصہ وجز کی ساخت میں مددگار ہوتی ہیں۔ پھر ہمارا کانشنس جیسا کہ اب موجود ہے۔ اور ہمیں حق و ناحق کی جو حس حاصل ہے اور اس آسمانی ابدی زندگی۔ خوبی اور خوبصورتی کا جو تصور رہتا ہے۔

اور مسیح میں جو ملائمت اور راستی پائی جائے اور میاں بیوی میں ایسی محبت ایمان اُمید ایک دوسرے کی طرف سے ہونا چاہئے اور آدمیوں میں ایسی جان نثاری اور سچائی ہو اور عورتوں میں ایسا خود انکارانہ تحمل اور ایسی عفت ہونی چاہیئے الغرض جن ساری صفات کا پہاڑی وعظ میں ذکر ہے اور جو مسیح کی انسانی سیرت ہے۔ کل فطرت نے اُن کے پیدا کرنے میں مدد کی ہے۔ پس پولوس رسول کا نتیجہ کیسا راست ثابت ہوتا ہے کہ "تم مسیح کا بدن ہو اور ایک دوسرے کے عضو" +

مذکورہ بالا بیان کو اگر مد نظر رکھیں تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ساری خلقت نے ایسی اعلےٰ اخلاقی روحانی سیرت پیدا کرنے میں تو مدد کی ہو اور کوئی اخلاقی روحانی ارادہ اس کا فاعل نہ ہو۔ اگر راستبازی اور پاکیزگی سچ مچ ہستی رکھتے ہیں تو وہ اُس عالم کا ضروری جز ہونگے اور ہم کو ضرور یہ کہنا پڑے گا کہ "خداوند اپنی ساری راہوں میں راستباز ہے اور اپنی ساری صفتوں میں پاک ہے" +

یہ وہ شخصی تجربہ ہے جس کا ذکر مزمور نویس نے کیا اور جو تقاضا ہم سے کیا گیا تھا اُن کا یہ جواب ہے کہ جب مسیحی دین ایک شخص خدا پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے تو اس مطالبہ کی بنیاد ہماری عین فطرت میں ہونی چاہیے وہ خدا اپنی ذات میں خواہ کچھ ہی ہو لیکن ہمارے لئے وہ عقل اور محبت ہے جس شخص کا کانشنس ان الفاظ سے روشن ہو جاتا ہے وہ اپنی ضمیر میں خدا کی حضوری کو محسوس کر کے اس بات کا قائل ہو جاتا ہے کہ وہ اخلاقی قوت یعنی عقل ارادہ اس کے بدن اور وجود کا بھی خالق ہے یہ نتیجہ شاید عام عقل کے سامنے اتنا واضح نہ ہو جتنا الگ الگ اشخاص پر واضح ہوگا۔ کیونکہ کانشنس ہر شخص کو

جدا جدا ہدایت کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ انسان کے ہر فعل کی دو علت غائیاں ہیں ایک طبعی اور ایک اخلاقی ۔

چوتھا لکچر

کانشنس کی شہادت اخلاقی حاکم کے بارے میں

"اگر میں آسمان کے اوپر چڑھ جاؤں تو تو وہاں ہے اگر میں پاتال میں اپنا بستر بچھاؤں تو دیکھ تو وہاں بھی ہے اگر صبح کے پنکھ لے کے میں سمندر کی انتہا میں جا رہوں تو وہاں بھی تیرا ہاتھ مجھے لے چلے گا۔ اور تیرا دہنا ہاتھ مجھے سنبھالے گا" ۔ (مزمور ۱۳۹: ۸-۱۰) ۔

ہم نے پہلے تو یہ ظاہر کیا تھا کہ حق اور ناحق کی حس ہم کو حاصل ہے پھر یہ دو باتیں ثابت کیں کہ ہم جو خدائے قادر مطلق حکیم مطلق اور رحیم مطلق پر ایمان رکھتے ہیں اس کی بنیاد کانشنس میں اور شخصی تجربہ میں ہے ۔ ہم نے یہ بھی بیان کیا کہ جب یہ حس پورے طور سے کام کرنے لگتی ہے تو ہمیں مزمور نویس کی طرح اس امر کا قائل کر دیتی ہے کہ ہمارا تعلق ایک مشخص راستباز ارادہ سے ہے ۔ اس سے یہ نتیجہ بھی نکلا جیسا ۱۳۹ مزمور میں ذکر ہوا کہ جو حاکم ہم سے ہر قول خیال و فعل میں اطاعت

چاہتا ہے وہ ہمارا خالق ہے ۔ جو راستباز آنکھیں تاریکی ہو یا اُجالا ہمارے دلوں کی تہ تک نظر مارتی ہیں انہوں نے ہمارے بے ترتیب مادہ کو بھی دیکھا جبکہ ہمارے اعضا میں سے کوئی بنا نہ تھا ۔ اگر ہماری فطرت کا یہ اعلےٰ اور زبردست قانون ہو کہ ہم کانشنس کی اطاعت کریں اور اخلاقی کمال یا روحانی خوبی کو اپنا مقصد جانیں تو یہ سارا انتظام ضرور ایک اخلاقی طاقت کے ہاتھوں میں ہوگا ۔ اور چونکہ ہم دہشت ناک اور عجیب و غریب طور سے اخلاقی اور معقول مقاصد کے لئے بنے ہیں تو ضرور ہمارا بنانے والا راستباز ذی عقل ارادہ ہوگا ۔ جب ہم یہ غور کرتے ہیں کہ انسان کس تجویز اور نقشہ کے مطابق بنا ہے تو کانشنس کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے ۔ اور جب ہم سوچتے ہیں کہ انسان کی کل فطرت اخلاقی اعلےٰ نشو و نما کے لئے کیسی متناسب ہے تب دلیل تجویز کا پورا زور ظاہر ہوتا ہے ۔ پس ایسے مشخص خدا پر ایمان لانا جو عقل و محبت سے کام لیتا ہے محض قیاسی منطقی نتیجہ نہیں ہے بلکہ کانشنس کی خاص ہدایت سے ہے ۔ اور تجربہ سے ثابت ہے مقدس نوشتوں میں جس خدا کا ذکر ہے وہ نہ صرف ایک راستباز ذوالعقل شخص ہے بلکہ وہ ساری دنیا کا انتظام اور اُس پر حکومت کرنے والا بھی ہے ۔ پس اب یہ ثابت کرنا چاہیئے کہ آیا کانشنس اور انسانی فطرت کے خدا میں بھی یہ صفت پائی جاتی ہے ۔ کیونکہ بائبل میں اور ہماری عبادت میں نہ صرف اس بات کا ذکر ہے کہ ہم کو اور سارے جہان کو ایک اخلاقی ذوالعقل ارادہ نے پیدا کیا بلکہ یہ بھی ذکر ہے کہ وہ ارادہ ہر جگہ عامل ہے پس ہمیں اپنی زندگی میں نہ صرف ایک ترتیب سے واسطہ ہے جس کا ذکر سائنس کرتی ہے بلکہ ایسی ترتیب کا ذکر جس کا انتظام اخلاقی مقصد کے

لئے ہوتا ہے۔ مزمور نویس فطرت کے ہر جز اور فعل کو عین خدا کا فعل قرار دیتا ہے۔ ہر معاملہ میں خواہ وہ بہت بڑا ہو خواہ بہت چھوٹا ایک فاعل شخص نظر آتا ہے۔ ایک طرف تو جلال کا خدا گرجتا ہے اور خداوند بہت پانیوں پر ہے۔ دوسری طرف وہ ہر جاندار کی خواہش پوری کرتا ہے۔ نہ صرف اس نے زمین کی بنیاد ڈالی ہے کہ وہ جنبش کرے بلکہ کوّے کے بچّوں کو جو اس سے فریاد کرتے ہیں روزی پہنچاتا ہے +

یہ کہنا درست نہیں کہ بائبل میں خدا کو ایک عظیم الشان انسان سے تعبیر کیا ہے۔ جو خاکہ کھینچا گیا ہے وہ ایسا اعلےٰ اور ایسا غیر محدود ہے کہ کسی انسان پر عاید نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ بھی کہا جائے کہ وہ ایک قسم کا انسان ہے لیکن وہ ہم سے بدرجہا بہتر ہے پھر بھی یہ ماننا پڑے گا کہ وہ ہم سے ایسے بیشمار درجے بڑا ہے کہ ہم اسے دوسری قسم کہے بغیر نہیں رہ سکتے۔ وہ ایسا قادر مطلق وجود ہے کہ "زمین کی گہری جگہیں اس کے ہاتھوں میں ہیں اور پہاڑوں کی قوّت بھی اسی کی ہے" لیکن ساتھ ہی وہ ایسا فروتن ہے کہ حلیم و خاکسار کے دل میں بھی آتا ہے۔ یہ خاکہ انسانیت کے تصور سے کہیں اعلےٰ و افضل ہے۔ "ہمارا خداوند بڑا ہے اور بڑی قدرت والا۔ اس کی سمجھ غیر محدود ہے۔ خداوند حلیموں کو سرفراز کرتا ہے اور شریروں کو زمین پر پٹک دیتا ہے"۔ اور وہ ایسا وجود ہے کہ اس کی آنکھ سے ہم کہیں چھپ نہیں سکتے اس کے ہاتھ سے بچ نہیں سکتے اس کے ارادہ سے بھاگ نہیں سکتے۔ "اگر میں آسمان کے اوپر چڑھ جاؤں تو تو وہاں ہے اگر میں پاتال میں اپنا بستر بچھاؤں تو تو دیکھ وہاں بھی ہے اگر صبح کے پنکھ لے کے میں سمندر کی انتہا میں جا رہوں تو وہاں بھی تیرا ہاتھ مجھے لے چلے گا اور تیرا

دہنا ہاتھ مجھے سنبھالے گا"+

اس یقین کے سامنے سائنس کا وہ بیان کہ فطرت میں غیر مشخص اسباب ہی ہیں کچھ وقعت نہیں رکھتا۔ کیونکہ سائنس کے بیان میں تو اسباب و قوانین کی ایک پیچیدہ کل ہی نظر آتی ہے۔ جو خود بخود بلا کسی فاعل کے چل رہی ہے اور اسے شخصی ضرورتوں کی کچھ پروا نہیں ہے۔ اگر سائنس کے اس بیان کو ہم قبول کر لیں تو ان صفات کی کوئی گنجائش نہ رہے گی کہ ہم ہمہ جا حاضر و ناظر شخص پر بھروسہ رکھیں حالانکہ یہ مسیحی دین کی جان ہے۔ سائنس کے اس بیان سے نہ صرف معجزوں کی گنجائش نہیں رہتی بلکہ دعا کی ضرورت بھی نہیں رہتی کیونکہ دعا شخصی مدد کی درخواست کرتی ہے۔ اس رائے کے مطابق دل سے یہ آواز نکلنا ناممکن ہوتا "کہ خداوند ان کے نزدیک ہے جو اسے پکارتے ہیں جو اسے سچائی سے پکارتے ہیں"۔ "جو اس سے ڈرتے ہیں ان کی وہ خواہش پوری کرے گا۔ وہ ان کی فریاد سُنے گا اور انہیں بچائے گا"+

ایک علّت اولیٰ کی ہستی کے محض ماننے کے ذریعے سائنس کے بیان کی مہلک تاثیر سے ہم بچ نہیں سکتے۔ علّت اولیٰ اگر وہ سچ مچ اولیٰ ہو) اس طرح ہمارے روزانہ تجربہ اور دل میں نہیں آ سکتا جیسے کہ مزمور نویس کا خدا آتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس علّت اولیٰ کو سائنس کے بیان کے مطابق کوئی فرض کرے پھر بھی وہ سائنس کی تحقیقات میں لگا رہے اور خدا کی پروا نہ کرے۔ اس لئے دینی زندگی ایسی علّت کا مطالبہ کرتی ہے جو نہ صرف اوّل ہے بلکہ آخر بھی ہے "جو الفا اور اومیگا اول و آخر جو پہلے تھا اور آنے والا ہے قادر مطلق"۔ اس لئے ہم اس بیان کے ساتھ اتفاق نہیں کر سکتے جب

سائنس نے ترقی کی تو مسیحی دین کے حامیوں نے خدا کو دو تین قدم پیچھے ہٹا دیا اور خدا و انسان کے درمیان چند علتوں کو حائل مان لیا۔ لیکن جب سائنس نے اور ترقی کی تو اس رائے کو مُنہ کی کھانی پڑی۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ سائنس ایسا فلسفہ ہے جو کبھی قرار نہیں پکڑتا بلکہ اس کا قانون ہے آگے بڑھنا جس کو ہم کل منزلِ مقصود سمجھتے تھے آج وہ روانگی کی جگہ ہے۔ فطرت کے ہر طبقہ پر یہ ایک ایک قدم بڑھاتی ہے اور جو عالم تقسیم علاقہ پر قناعت کرنا چاہتے ہیں ان کی کوشش بے فائدہ ثابت ہوگی۔ مقدس نوشتوں اور سائنس میں وہ الگ الگ دعاوی فطرت کے کل دائرہ کے لئے ہیں اگر وہ دائرہ ایک دوسرے کے مزاحم ہیں تو ایک کو ترک کرنا پڑے گا۔ لیکن میرے خیال میں وہ ایسے مزاحم نہیں بلکہ وہ ایک ہی امر کے دو مختلف پہلو ہیں اور دونوں ضرور اور درست ہیں ۔

اب ہم اول تو یہ دریافت کریں کہ کس تجربہ کی بنیاد پر مزمور نویس اور انبیا نے خلقت کے ایک مشخص خالق کا یقین کیا۔ ان کے اس یقین کی جڑ بھی کانشنس میں اور حق و ناحق کے تقاضوں میں پائی جاتی ہے جو طاقت راستبازی کو زندگی کا قانون ٹھہراتی ہے اُس کی نسبت یہ یقین بھی کرنا پڑے گا کہ وہ اُس قانون کو جاری کرنے اور آخر کار اس کو پورے طور سے کامیاب کرنے کے قابل ہے البتہ یہ یقین از قسم ایمان ہے نہ از قسم دلیل اثباتی۔ بائبل اور تواریخ سے بخوبی ظاہر ہے کہ اس ایمان سے کیسی سخت آزمائش ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تو خود نبیوں کو یہ چلّانا پڑا کہ "قانون ڈھیلا ہو گیا ہے اور عدالت جاتی رہی" لیکن کانشنس نے

ان کو مایوسی کی دلدل میں پھنسنے سے بچایا۔ اگر حق درحقیقت قوت نہ ہوتا تو شائد پھر بھی یہ دعویٰ کرتا کہ انسان اُس کی اطاعت کرے مگر ایسی صورت میں زندگی ایک تمسخر اور سخت ظلم ہوتی۔ پس راستبازی کا خدا بالضرور با قدرت خدا بھی ہوگا۔ مزامیر میں اس طور پر خدا کی طاقت کا ذکر آیا ہے۔ فطرت میں جب خدا کا بیان کیا گیا ہے تو اُس کے ساتھ اُس کی راستبازی اور عدالت کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ خدا کی عظمت و شوکت کا اظہار جہان کے کاموں میں ہوتا ہے (دیکھو مزمور ۱۰۴) چنانچہ لکھا ہے کہ وہ حشمت و جلال کا لباس پہنے ہوئے ہے وہ نور کو پوشاک کی مانند پہنتا ہے اور آسمانوں کو پردے کی مانند پھیلاتا ہے "کہ اے خداوند تیری صفتیں کیا ہی بہت ہیں...... زمین تیرے مال سے پُر ہے" اِس دھیان اور غور کے بعد فوراً وہ غصّہ سے بھر کر یہ چلّا اٹھتا ہے "کاشکہ گناہ کرنے والے زمین سے فنا ہو جائیں اے میری جان خداوند کو مبارک کہہ" خالق کی اس عظیم الشان قدرت کا مقصد یہ ہے کہ زمین پر سے گناہ اور بدی جلا کر بھسم کر دی جائے۔ پس کانشنس نہ صرف خدا پر دلالت کرتا ہے بلکہ ایسے خدا پر جو قادرِ مطلق ہو۔

اسی قسم کا یقین کانشنس کو اس امر کے مطالبہ پر بھی مجبور کرتا ہے کہ زندگی کے ہر کاروبار میں اخلاقی فاعل کامیاب ہو۔ اگر راستبازی اعلےٰ قانون ہے تو چاہئے کہ وہ ہر جگہ موثر ہو نہ کہ آخر کار۔ اگر میں آسمان پر چڑھ جاؤں تو کانشنس کی آواز وہاں بھی سنائی دے گی۔ اگر پاتال میں اپنا بستر لگاؤں تو وہاں بھی وہ موجود ہے اور اگر سمندر کی تہ میں جا بسوں وہاں بھی وہ عجیب آواز میرا پیچھا کرتی ہے۔ الغرض اگر ہر حالت اور ہر جگہ میں اخلاقی فرائض سے مجھے گریز نہیں ہو سکتا تو مجھے از راہ عدل یہ ماننا پڑے گا کہ جو

طاقت مجھ سے مطالبہ کرتی ہے تو وہ میری طاقت و لیاقت کے مطابق
ہر حالت میں میری مدد کرے گی۔ جس جہان میں ہر شے کا انتظام محض
طبعی حالات کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور جس میں اخلاقی مداخلت کی
گنجائش نہیں تو اس میں ممکن ہے کہ آخرکار سزا ملے لیکن اُس میں افراد سے
اُن کی حیثیت یا حالت کے مطابق درست سلوک کی امید نہیں رکھ سکتے۔
شاید ایسے جہان میں نوع انسان کی تربیت ہو لیکن افراد کی تربیت ہو نہیں
سکتی۔ لیکن کانشنس کی آواز افراد کی تربیت اور شخصی اصلاح طلب کرتی
ہے جیسا کہ مزمور نویس کے تجربہ سے ظاہر ہے۔ کیا یہ انصاف نہیں کہ خداوند
گرے ہوؤں کو سنبھالے اور جو خم ہو گئے اُن کو سیدھا کھڑا کرے۔ ہر طبعی
قانون تو یہ ہے کہ زبردست کمزوروں کو کچل ڈالے اور توبہ کی کوئی گنجائش
نہ ہو چونکہ ہم مشخص وجود ہیں ایسا قانون ہماری اخلاقی روحانی بہبودی کا
باعث نہیں ہو سکتا۔ رسول نے یوں کہا کہ "خدا راستباز ہے وہ تمہیں
تمہاری طاقت سے بڑھ کر آزمائش میں نہ پڑنے دیگا بلکہ آزمائش کے ساتھ
نکل جانے کی راہ بھی بنا دے گا تاکہ تم برداشت کر سکو" یعنی جو لوگ دل و جان
سے آزمائشوں کا مقابلہ کر رہے ہیں لیکن آزمائشیں اُن کی طاقت سے
بڑھ کر ہیں اگر خدا اُن کی مدد نہ کرے تو کس طرح خدا راستباز ٹھہر سکتا ہے +

مقدس نوشتوں کے مصنف دو طرح کے انصاف کے درمیان امتیاز
کو بخوبی مدنظر رکھتے ہیں۔ یعنی ایک انصاف افعال کا لحاظ کرتے ہیں ایک
انصاف اشخاص کا لحاظ کرتے ہیں۔ جو انصاف افعال ہی کا لحاظ کرتا ہے
وہ قوانین کو جاری کرائے گا لیکن جس باپ کو بچوں سے سلوک کرنا ہے اگر
وہ سختی سے اِن قوانین کو سب پر یکساں جاری کرے تو اُس کے لئے

یہ انصاف نہ ہوگا۔ اس پدرانہ اور شخصی حکومت کے قانون کا ذکر مزمور نویس
نے کیا ہے "جیسے باپ بچوں پر ترس کھاتا ہے ویسے خداوند ان پر ترس کھاتا
ہے جو اُس سے ڈرتے ہیں وہ ہمیشہ انہیں تنبیہ نہ دے گا نہ اپنا غصہ ہمیشہ
تک رکھ چھوڑے گا اُس نے ہمارے گناہوں کے مطابق ہم سے سلوک
نہیں کیا نہ ہماری بدیوں کے مطابق ہمیں اجر دیا ہے" +

آجکل کے بعض عالموں کی یہ رائے درست نہیں ہو سکتی کہ کامل خدا
کے یہ شایاں نہیں کہ ہماری طبعی حالت کے بدلنے میں دخل دے بلکہ
کامل خدا وہ ہے جو غیر متبدل قوانین کے ذریعہ جہان کا انتظام کرتا ہے
البتہ اگر ہم یہ مان لیں کہ یہ جہان ایک کل ہے اور ہم محض اس کے پرزے
ہیں تو کامل موجد یا صانع کی شایاں نہ ہوگا کہ متواتر اس کا عمل روکنے میں
دخل دے۔ لیکن اگر ہم اشخاص ہیں جنہیں حق و ناحق کی حس حاصل ہے
تو یہ کہنا ہمارا حق ہے کہ ہم سے درست سلوک کیا جائے ہم پر ترس کھایا
جائے اور ہم پر رحم ہو اور ہمارے روحانی باپ سے ہمیں مدد ملے
اور اگر ایسا باپ اور خالق اخلاقی مقاصد کے لئے دخل نہ دے تو اُس کی
شان کے ہرگز لائق نہ ہوگا۔ اگر اخلاقی اشخاص کا انتظام غیر متبدل قوانین کے
ذریعہ ہو تو کسی پر انصاف نہ ہوگا۔ جیسے انسانی قانون کو انسانی عدل کے
ذریعہ بدلنا پڑتا ہے ویسا ہی ضرور ہے کہ خدا انسان کے ساتھ برتاؤ میں
عدل کے مطابق قانون کو بدلے۔ اِن عالموں کی رائے میں جو غلطی ہے
وہ یہ ہے کہ جو طاقت لفظی طور پر قانون کے مطابق عمل نہیں کرتی وہ بے لگام
طاقت ہے۔ برعکس اس کے اعلیٰ درجہ کا انصاف وہ ہے جو راستبازانہ
شخص کی آزادانہ اخلاقی ارادہ سے سرزد ہو اور شخصی ضرورتوں لیاقتوں اور

کمزوریوں کے مطابق ہو۔ فی الحقیقت جو خدا انسانوں کا انتظام بے تبدیل طبعی قوانین کے ذریعہ کرے وہ ایسا خدا ہوگا جس نے ایک بے کل کا کام ہمیشہ کے لئے کردیا اور بے رحمی سے دیکھ رہا ہے کہ اس کے نتیجے اُس کی مخلوقات اُٹھا رہی ہے۔ بے تبدیلی جو خدا کی ایک اعلےٰ صفت ہے وہ اُس کی دائمی مستقل راستبازی ہے یا یہ کہو کہ اُس کی محبت ہے۔ چنانچہ مزمور نویس خدا کی راستبازی اور رحمت کو لازم ملزوم ٹھہراتا ہے "آدمی تیری بڑی رحمت کو کثرت سے یاد کریں گے تیری راستبازی کے گیت گائیں گے خداوند رحیم و کریم ہے غصہ کرنے میں دھیما اور شفقت میں بڑھ کر ہے"۔ راستباز خدا کا یہ تصور تھا جس نے اسرائیلیوں کے دلوں پر اثر کیا۔ اِس یقین کے بعد کہ حق ایک قوت ہے۔ اور راستباز خدا قادر مطلق خدا بھی ہوگا یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ وہی راستباز وجود اپنی راستبازی کے باعث ہر شخص کے پاس ہر جگہ موجود ہے۔ آسمان میں۔ پاتال میں۔ سمندر کی تہ میں وغیرہ اور ہر ایک کی ضرورت کے مطابق مدد کرتا ہے ٭

بعضوں نے یہ بھی اعتراض کیا ہے کہ اگر کانشنس کی دلیل سے یہ نتیجہ نکلا تو نتیجہ سائنس کے اِس نتیجہ سے کیسے مطابق ہوگا کہ قوانین کے عمل کا یکساں نتیجہ نکلتا ہے۔ اگر اخلاقی راستباز شخص مداخلت کرتا ہے تو چاہیے تھا کہ طبعی قوانین کا نتیجہ یکساں نہ نکلتا بلکہ اُس میں کچھ فرق آجاتا ہے۔ بعض دینی عالموں نے پہلے پہل یہ بیان کیا تھا کہ فطرت میں کل قوانین اخلاقی ہیں سائنس کہتی ہے کہ کل قوانین طبعی ہیں۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ دونوں رائیں درست ہیں یہ قوانین ایک دوسرے کے مزاحم نہیں بلکہ دو طبقوں میں اپنا اپنا عمل الگ الگ کر رہے ہیں ٭

الغرض الٰہی ارادہ کے اخلاقی عمل پر سائنس جو اعتراض کرتی ہے وہ ترتیب فطرت اور واقعہ کو جو اُس ترتیب میں ظاہر ہوتا ہے خلط ملط کر دیتی ہے اور یہ وہی پرانا جھگڑا ہے کہ مرغی انڈے سے ہوئی یا انڈا مرغی سے یعنی علت پہلے ہے یا معلول یا جو پہلے ظاہر ہوتا ہے اُس کو علت اور جو پیچھے ظاہر ہو اُس کو معلول کہیں۔ فرض کرو دو واقعات کا امکان ہے۔ اب یہ میری مرضی پر موقوف ہے کہ کونسا واقعہ ظہور میں آئے۔ اُن میں سے جو واقعہ ظہور میں آتا ہے وہ ترتیب فطرت کے مطابق ہے اور نتیجہ سائنس دان پر ظاہر ہوتا ہے اس لئے معجزوں کے بارہ میں یا دیگر معمولی الٰہی مداخلتوں کے بارہ میں یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ان سے ترتیب فطرت میں خلل اندازی ہوتی ہے۔ شائد اس ترتیب میں خلل اندازی ہوتی جو غیر معمولی علت کے داخل کئے جانے سے پیشتر ظہور میں آتی لیکن جب ایک سبب پیدا ہوگیا اور اس نے اپنا نتیجہ ظاہر کیا تو اس کے ذریعہ نہیں کہہ سکتے کہ ترتیب فطرت معطل ہوئی یا اُس میں خلل واقع ہوا۔ علاوہ ازیں اس قسم کے اعتراضات میں لوگ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ فطرت کی یہ طبعی ترتیب محدود ہے اور اس کے مظہرات محدود ابتدا اور انتہا کی حدود سے گھرے ہیں۔ لیکن اگر برعکس اِس کے (جیسا کہ سائنس دان آجکل مانتے ہیں) یہ ترتیب غیر محدود مانی جائے تو ایک حصہ میں کسی طرح کا دخل یا دباؤ کسی دوسرے حصہ میں ابھار وغیرہ کے ذریعہ سے وزن برابر رکھے گا جیسے سمندر میں طوفان وغیرہ کے بعد سطح سمندر ہمیشہ ہموار ہو جاتی ہے۔ ایک جگہ سمندر اُٹھتا ہے دوسری جگہ نیچا ہو جاتا ہے۔ یہی حال شائد ترتیب فطرت کا ہو۔ جس کا ایک حصہ نظر آتا ہے دوسرا حصہ ہماری نظروں سے غائب ہے ٭

یا شائد معجزوں کو ترتیب فطرت کے راگ میں سُر کی تبدیلی کہیں ۔ راگ جاری رہتا ہے باجے کے ایک بند یا کھونٹی کے مروڑنے سے سُر میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے ۔ شائد الٰہی ارادہ کے معمولی اخلاقی عمل کی یہ اچھی مثال ہے جو حکمت کی کتاب میں پائی جاتی ہے ۔ کہ یہ عناصر ایک طرح کا باجا ہیں ۔ فرض کرو کہ تم ایک عمدہ باجا بجتا سُن رہے ہو بجانے والا نظروں سے غائب ہے اور صرف سُر ہی سُنائی دیتا ہے اور تاروں کی حرکات نظر آتی ہیں ۔ غور کرنے کے بعد شائد تم یہ نتیجہ نکالو کہ یہ آوازیں باقاعدہ قانون کے مطابق نکل رہی ہیں اور شائد راگ کا حقیقی قانون دریافت بھی نہ ہو تو بھی یہ ماننا پڑے گا کہ ایسا کوئی قانون ہے ۔ باوجود ایسے قانون کے بھی بجانے والے کی مرضی کے مطابق سیکڑوں راگنیاں بھیرویاں اور سُر پیدا ہو سکتے ہیں اور راگ کے عام قانون میں کوئی فرق نہیں آتا ۔ فطرت کے باجا کا بھی یہی حال ہے کہ راگ برابر قانون کے مطابق نکلتا ہے لیکن سُروں اور راگنیوں میں اُس الٰہی ہاتھ کے ذریعہ کچھ تبدیلی ہوتی جاتی ہے ۔

اس سے بھی بڑھکر انسان کا بدن ہے اس کے عام کاروبار حرکات و سکنات خون کے دوران پر موقوف ہیں باوجود اس قانون کے کون نہیں جانتا کہ انسان کی مرضی و عقل سے ان میں تبدیلی ہو سکتی ہے اور ہوتی رہتی ہے ۔ یہ بدن انسانی بھی اُس طبعی قانون کے تابع ہے جس کے تابع دیگر ابدان و اجسام ہیں ۔ لیکن پھر بھی انسان کی مرضی اور عقل ہر جزو میں موجود ہے اور ہر جزو و عضو کی حرکت اور فعل کو بدل سکتی ہے ۔ یہ کل عالم ایک بدن ہے اور طبعی قانون کے تابع ہے جیسے ہمارے بدن لیکن یہ خالق کے شخصی فعل اور ارادہ کے مزاحم نہیں ۔

الغرض ہمیں ان دو امور میں سے ایک ماننا پڑے گا اول تو یہ ہے کہ انسانی ارادہ ترتیب فطرت سے ایک خارجی قوت ہے اور طبعی فعل میں فرق ڈالے بغیر یہ دخل دیتی ہے یا یہ کہ انسانی ارادہ ترتیب فطرت کا جز ہے اس لئے اُن کا عمل عین ترتیب فطرت ہے ۔ اول صورت میں ظاہر ہے کہ عام ترتیب میں خلل ڈالے بغیر خدا دخل دے سکتا ہے اور دوسری صورت میں یہ یقینی بات ہے کہ کانشنس کے عملی مقاصد کے لئے انسانی ارادہ ایک اخلاقی فاعل ہے الغرض خواہ کچھ ہی تشریح کرو ۔ کانشنس اخلاقی سیرت رکھتا ہے اور رکھیگا ۔ کوئی سائنس دان اس کے خلاف تمنا نہ کرے گا پس اگر انسانی اخلاقی ارادہ فطرت کی طبعی ترتیب کے مطابق ہے تو کیوں الٰہی ارادہ نہیں ہو سکتا ۔

ان مثالوں کی وقعت اور قدر خواہ کچھ ہی ہو پھر بھی ہم ان کو دلیل کی اصلی جز نہیں ٹھیراتا ۔ جب میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ ایک مشخص خدا موجود ہے اور کام کر رہا ہے تو میں اُس کے لئے اُسی قسم کی شخصیت کا دعویٰ کرتا ہوں جیسی کہ ہمیں حاصل ہے ۔ اگر میرا شخصی ارادہ اور عقل فطرت کی ترتیب کے خلاف نہیں تو کیوں اُس کا ارادہ خلاف ہوگا ۔ اس دلیل میں ہمیں اپنے شخصی تجربہ پر دارمدار رکھنا چاہیئے ۔ سائنس فطرت کے مقررہ قوانین کے بارہ میں خواہ کچھ ہی بتائے انسانی ذات میں پیار و نفرت تعریف و ملامت کی صفات تو رہیں گی اور ان شخصی صفات و افعال میں سائنس جتنی ترقی کرے اتنا ہی یہ واضح ہوگا کہ صرف طبعی زندگی نہیں بلکہ اخلاقی زندگی بھی ہے اور یہی مقدس نوشتوں کا بیان ہے جو سائنس طبعی زندگی کے بارہ میں سکھاتی ہے وہ بھی درست ہے اور جو نوشتے اخلاقی روحانی زندگی کے بارہ میں سکھاتے ہیں وہ بھی درست ہے یہ دونوں بیان نقیض نہیں ہیں ۔

پانچواں لکچر

یسُوع مسیح کے بارہ میں اخلاقی شہادت

"جو کچھ ہم نے دیکھا اور سُنا اُس کی خبر تمہیں دیتے ہیں تاکہ تم بھی ہمارے ساتھ شراکت رکھو اور ہماری شراکت باپ کے ساتھ اور اُس کے بیٹے یسُوع مسیح کے ساتھ ہے" (۱ یوحنا ۱: ۳)۔

مجھے امید ہے کہ گزشتہ لکچروں سے اس امر کی تشریح ہوئی کہ ہم ایک شخص خدا پر ایمان رکھتے ہیں جس کی قدرت حکمت اور احسان غیر محدود ہے اور اس ایمان کی بنیاد کانشنس کی ہدایت پر ہے۔ اب ہم اس مضمون کے دوسرے حصہ کو شروع کرتے ہیں یعنی خاص مسیحی ایمان یسُوع مسیح کی الوہیت کے بارہ میں اور ان مکاشفوں کے بارہ میں جو مسیح اور اُس کے رسولوں اور نبیوں نے بیان کئے ہیں۔ ابتدائی اصول کی پختگی پر یہ ایمان بھی موقوف ہے۔ یعنی قبل از مسیحی اور یہودی مکاشفہ کے جب تک انسان کو خدا کا کچھ حقیقی علم نہ ہو تو ان مکاشفوں میں سے کسی کو قبول کرنے کی کافی وجہ اُن کے پاس نہ ہوگی کیونکہ ان کے پرکھنے کے لئے ان کے پاس کوئی کسوٹی نہ ہوگی۔ جو تجربہ مزمور ۱۳۹ میں قلمبند ہوا ہے وہ بقول پولوس رسول کے نوع انسان کا تجربہ ہے۔ چنانچہ اس نے کہا "جس حال کہ انہوں

نے پسند نہ کیا کہ خدا کی پہچان کو حفظ کر رکھیں خدا نے بھی ان کو عقل کی بے تمیزی میں چھوڑ دیا کہ نالائق کام کریں" پولوس نے اہل آتینی۔ اہل روم کو نصیحت کرتے وقت یہ فرض کر لیا کہ سامعین کو خدا کا علم کچھ حاصل ہے اس لئے کہتا ہے کہ جو تعلیم میں دیتا ہوں وہ اُس علم کے مطابق اور اس کی تکمیل ہے اس امر میں ہم معلوم سے نامعلوم کی طرف قدم بڑھاتے ہیں جیسے ہم عقل کے سادہ افعال سے پیچیدہ افعال کی طرف بڑھتے ہیں ویسے ہی ایمان کے سادہ افعال سے جو کانشنس کی ہدایت سے پیدا ہوتے ہیں ایمان کی اعلےٰ چوٹیوں کی طرف چڑھ سکتے ہیں جن کا مکاشفہ مسیحی عقیدہ میں درج ہے۔

اب ہم یہ دریافت کریں کہ جیسے خدا پر ایمان لانے کی بنیاد کانشنس میں ہے کیا ویسے یسُوع مسیح کی الوہیت کی بنیاد بھی کانشنس میں ہے جب تک ہم یہ بنیاد دریافت نہ کرلیں تب تک مسیحی دین ایک قیاس یا ایک فلسفہ ہوگا زندہ قوت نہ ٹھیریگا۔ رسول خود اور ان کے سامعین خواندہ لوگ نہ تھے کہ علمی تحقیقات یا سائنٹفک تجربہ کر سکتے۔ آج کل عوام الناس کا یہی حال ہے اُن پر ہمارے وعظوں کا کچھ اثر نہ ہوگا جب تک اُن کے رُوحانی دلی تقاضوں کو نہ چھو سکیں۔ زندگی بخش دین اور زندگی بخش اخلاق فیلسوفوں سے خطاب نہ کریگا۔ بلکہ عوام الناس کو مخاطب کریگا اس لئے اُس دین و اخلاق کی جڑ معمولی تجربہ میں ہونی چاہیئے۔ ظاہراً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسیحی عقیدہ بہت بھاری مشکل ہے مثلاً ایک شخص کو جو انسانی صورت میں ظاہر ہوا خدا تسلیم کرنا۔ اُس کی ایسی عزت و اطاعت کرنا اور اُس پر ایسا توکل رکھنا جو صرف خدا ہی کا حق ہے لیکن جس صفائی اور زور سے خدا کا خیال ہماری عقل اور کانشنس میں تصدیق پائے گا اُسی قدر یہ ایمانی باتیں پرضرور معلوم ہونگی۔

اس عقیدہ کی تواریخی حقیقت کو معلوم کرنے کے لئے ہم اپنے خیال میں اپنے تئیں پولوس کی طرح اس وقت کا ایک یہودی فرض کرلیں جب مسیح کی الوہیت کی منادی پہلے پہل ہوئی۔ یونانیوں کے لئے تو اس الوہیت کے ماننے میں غالباً کوئی عقلی دقت نہ تھی۔ البتہ مسیح کی صلیب ان کے لئے ٹھوکر کا باعث تھی۔ لیکن خدا کا انسانوں کی صورت میں ظاہر ہونا ان کی روایات کے مطابق تھا۔ اس لئے انہیں مشکل کم تھی کیونکہ ان کا تصور خدا کے بارہ میں بہت ادنیٰ تھا۔ ان کے دیوتا عظیم الشان انسان تھے اس لئے ان کے لئے انسان کی صورت میں ظاہر ہونا ان کی کسر شان نہ تھا۔ پہلی تین صدیوں کی بدعتیں گویا کوششیں تھیں کہ خدا کے اس ادنےٰ تصور سے اعلےٰ تصور کی طرف ترقی کریں آریَن بدعت اس کوشش میں آخری قدم تھا۔ اور اس کی شکست نے مسیحی تصور کو ہمیشہ کے لئے یونانی اور بُت پرست تصوروں سے آزاد کردیا۔ لیکن یہ حال پولوس کا نہ تھا اس کے سامنے ایسے مسئلہ کو ماننا ایک بھاری مشکل تھی یہ حال آج تک یہودیوں اور محمدیوں کا ہے۔ کیونکہ یہودی مذہب کا خاص پیغام اور مقصد یہی تھا کہ خدا کے تصور کو زیادہ اعلےٰ و روحانی بنائیں۔ جیسا لکھا ہے کہ "میرے خیال تمہارے خیال نہیں نہ تمہاری راہیں میری راہیں ہیں خداوند فرماتا ہے جسقدر آسمان زمین سے بلند ہیں اُسی قدر میری راہیں تمہاری راہوں سے اور میرے خیال تمہارے خیالوں سے بلند ہیں"۔ پولوس نے یہ سُنا کہ اُس کی قوم میں سے ایک نے یہ دعویٰ کیا کہ میں وہی خدا ہوں جس کا نام لینے سے بھی یہودی ڈرتے تھے۔ حالانکہ یہ شخص ایک ذلیل علاقہ کا باشندہ تھا اور آخرکار مجرموں کے طور پر صلیب پر کھینچا گیا۔

لیکن پولوس کے نزدیک کسی انسان کا ایسا دعویٰ کرنا سخت گھمنڈ اور تکبر تھا۔ اس لئے کچھ تعجب نہیں بلکہ یہ طبعی بات تھی کہ جب پولوس نے یہ دعویٰ سُنا تو وہ سخت ناراض ہوا اور ایسے دعویٰ کو ناقابل برداشت کفر سمجھا۔ اگر وہ اپنے زمانہ کے اکثر یہودیوں کی طرح نبیوں کی باتوں کے ماننے میں سُست اعتقاد نہ ہوتا تو یہ مشکل اُسے پیش نہ آتی۔ مگر اُس کی آنکھیں نبیوں کے کلام کے اعلےٰ روحانی معنی سمجھنے کے لئے بند تھیں۔ جو کچھ اس نے کیا نادانی سے کیا۔ اسی نادانی کے باعث یہ فضل اس پر ہوا کہ خود نجات دہندہ اُس پر ظاہر ہوا تاکہ اُس کے تعصب کو توڑ ڈالے۔

مقدس پولوس اس مشکل کی خاص مثال ہے۔ جو یہودیوں کو مسیح کے دعاوی ماننے میں پیش آتی ہیں۔ اور اُس مشکل کو حل کرنے کے لئے کیسی عجیب کوشش چاہئے۔ ہمارے لئے بھی جب تک کہ ہم اس تاثیر کے حلقہ سے باہر رہتے ہیں۔ یہی مشکل پیش آتی ہے۔ کہ ہم کیونکر اقرار کریں۔ کہ یسُوع مسیح خدا ہے۔ یہ سوال کرنا واجب ہے کہ شروع میں کسی بنا پر یہ عقیدہ مانا گیا اور اب کسی بنا پر ماننا چاہیئے۔ جس خط سے لکچر کے شروع کے الفاظ لئے گئے ہیں اُس میں اس کا عجیب بیان ہے "زندگی جو شروع سے تھا جسے ہم نے سنا اور اپنی آنکھوں سے دیکھا اور تاک رکھا اور ہمارے ہاتھوں نے چھوا کیونکہ وہ زندگی ظاہر ہوئی اور ہم نے اُسے دیکھا اور ہم گواہی دیتے ہیں اور اُس ہمیشہ کی زندگی کی خبر تم کو دیتے ہیں۔ جو باپ کے پاس تھی اور ہم پر ظاہر ہوئی جو کچھ ہم نے دیکھا اور سنا اس کی خبر تمہیں دیتے ہیں۔ تاکہ تم بھی ہمارے ساتھ شراکت رکھو اور ہماری شراکت باپ کے ساتھ اور اس کے بیٹے یسُوع مسیح کے ساتھ ہے"۔ یوحنا جو

پولوس کی طرح یہودیوں کا یہودی تھا۔ کیسے یہ کہہ سکتا تھا کہ اس کی آنکھوں نے اُس ہمیشہ کی زندگی کو دیکھا جو باپ کے ساتھ تھی اور اُس کے ہاتھوں نے اُسے چھُوا۔

مسیحی یقین کیونکر پیدا ہوا گو یہ کسی قدر معجزوں پر مبنی معلوم ہو یا مسیح کی قیامت کے بڑے تواریخی واقعہ پر لیکن پھر بھی ایسا یقین حقیقت میں اخلاقی ہے۔ یعنی کسی بیرونی واقعہ پر مبنی نہیں۔ جہاں تک یہ عقیدہ حقیقی ہے یہ عقل کی ہدایت سے پیدا نہیں ہوا بلکہ دل سے۔ اس لئے یہ کانشنس کو مخاطب کرتا ہے۔ چنانچہ آیت مذکورہ بالا میں یہ بیان ہوا کہ جس کو ہم نے دیکھا اور سُنا اُس کی خبر تمہیں دیتے ہیں جسے یوحنا نے دیکھا اور سنا اُسے وہ زندگی کا ازلی کلام سمجھتا ہے۔ اور وہ یوں اُس کی تشریح کرتا ہے "وہ خبر جو ہم نے اُس سے سُنی۔ اور پھر تمہیں دیتے ہیں سو یہی ہے۔ کہ خدا نور ہے اور اُس میں تاریکی ذرا بھی نہیں۔ اگر ہم کہیں کہ ہم اُس کے ساتھ شراکت رکھتے ہیں اور تاریکی میں چلتے ہیں تو جھوٹ بولتے اور سچ پر عمل نہیں کرتے پر اگر ہم نور میں چلیں جس طرح وہ نور میں ہے تو ہم ایک دوسرے کے ساتھ شراکت رکھتے ہیں اور اُس کے بیٹے یسوع مسیح کا لہو ہم کو سارے گناہ سے پاک کرتا ہے" جس مکاشفہ نے یوحنا کو قائل کیا کہ یسوع مسیح کی عزت اور محبت ویسی کرنی چاہیے جیسی خدا کی اُس کا لبِّ لباب یہاں دیا گیا ہے اور یہ لبِّ لباب اخلاقی ہے۔ کہ خدا نور ہے اور اس میں تاریکی ذرا بھی نہیں۔

ان الفاظ میں سادہ طور پر اُسی قسم کی روایت پائی جاتی ہے جس نے پولوس کے دل کو قائل کیا اس نے محسوس کیا کہ میں ایک مقدس حضوری

ایک صاف شفاف نور کے کرہ میں ہوں جو اخلاقی روحانی آفتاب اُس پر طلوع ہوا اُس کی شعاعوں کو کوئی حجاب یا بدی کا سایہ چھپا نہیں سکتا تھا۔ وہ گویا تبدیل صورت کے پہاڑ پر چڑھ گیا تھا۔ اور ہر طرح کے بادل اور بخارات جو دلوں اور تمیزوں کو تاریک کر دیتے ہیں وہ سب نیچے رہ گئے تھے۔ اور اپنی روح میں اُن سے اپنے خداوند کو پہچانا جس کا لباس سفید اور چمکیلا تھا۔ وہ ایک تنگ وادی کے رہنے والے کی طرح تھا۔ جو یک لخت پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا دیا گیا۔ جس چوٹی پر آفتاب کی شعاعیں ہمیشہ پڑتی رہتی ہیں وہ ایسے اخلاقی روحانی نور میں آگیا جو اُس کے وجود کی رگ رگ میں سے گذر گیا اور اس میں تاریکی کا سایہ تک بھی نہ رہنے دیا اس بیان کا مقابلہ انجیل کے بیان کے ساتھ کرنے سے اس کے اخلاقی معنے ظاہر ہوتے ہیں "اُس میں زندگی تھی اور وہ زندگی انسان کا نور تھی اور نور تاریکی میں چمکتا ہے .... حقیقی نور وہ تھا جو دنیا میں آکے ہر ایک آدمی کو روشن کرتا ہے ...... وہ ہمارے درمیان رہا۔ اور ہم نے اُس کا ایسا جلال دیکھا جیسا باپ کے اکلوتے کا جلال" یوحنا کے دل میں باپ کے اکلوتے کا یہی تصور تھا کہ وہ فضل اور سچائی سے معمور تھا فضل اور سچائی اخلاقی اور روحانی زندگی اور نور یہ ایسی صفات ہیں جن کے ذریعے سے اُس کا دل قائل ہو گیا۔

مخفی نہ رہے کہ یہ قیاسی دلیل نہ تھی اور نہ اتفاقی مکاشفہ بلکہ یہ صاف تجربے کی بات تھی کیونکہ تجربہ یہی ہے کہ دیکھیں سُنیں اور چھوئیں فضل اور راستی کا یہ جلال یوحنا کو ایسا صاف نظر آیا جیسا کہ دوپہر کو سورج جب بادل نہ ہوں۔ اس سورج کی شعاعیں اُس وقت اُس پر چمکیں جب روز اُس سے ملاقات ہوتی اُس کے سینے پر جھکتا اُس کی آنکھوں کو دیکھتا اُس کی باتوں

کو سنتا اور اُس کے نقشِ قدم پر دھیان کرتا تھا۔ معمولی زندگی کے ہر فعل اور
کام میں یہ سورج اُس پر چمکا اور نیز اُس وقت چمکا جب وہ اعجازی قدرت
اس سے ظاہر ہوتی تھی جو اُن کے فضل اور راستی کے مطابق تھی اور فطرت
میں یا انسان میں جو کچھ اُس کی ذات کے خلاف تھا اس کو دور کرنے کے
قابل تھی اس مکاشفہ کے غیر محدود جلال کا پورا تصور کرنا ہماری طاقت میں
نہیں لیکن اس تاثیر کے ذریعہ سے اُس کا کچھ تصور کر سکتے ہیں جو چاروں
اناجیل کے پڑھنے سے ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ اناجیل خداوند کی زندگی اور سیرت
کا خاکہ ایسے طور سے بیان کرتی ہیں۔ کہ نہ صرف کلیسیا بلکہ جہاں مداح ہے
اور ان کی منعکس شعاعیں ہر زمانے اور ہر ملک میں اخلاقی طبقے کے
آفتاب کی طرح کام کرتی رہی ہیں اور انسان کے دل میں نئی زندگی اور خوبی
کو جگاتی رہی ہیں۔ فرض کرو کہ اُس تاثیر کو ہم چند در چند کردیں۔ اور اُن کی
تاثیر صاف سچے دلوں پر پڑنے لگے تب ہم اس اعلیٰ تاثیر کا کچھ خیال کر
سکتے ہیں جس کے سبب سے آدمیوں نے سرِ تسلیم خم کیا۔ اس میں
کچھ شک نہیں کہ نبیوں کی تعلیم کے ذریعے بھی قوم یہود کی روحانی تربیت
مدت تک ہوتی رہی تھی اور وہ مقدس نوشتوں کی لکھی رویتوں کو اپنی
آنکھوں کے سامنے پورا ہوتا دیکھ رہے تھے۔ لیکن اُن کے دل قائل
اُسی وقت ہوئے جب اعجازی فضل اور سچائی نے اعجازی قدرت کے
ساتھ مل کر اپنا جلوہ دکھایا۔ یوں یہودیوں نے مانا کہ زندگی کا خداوند ان کی
آنکھوں کے سامنے مجسّم ہوا تھا۔

اس کی زیادہ توضیح کے لئے ہم گزشتہ لکچروں پر ذرا نظر ماریں۔
ہم نے اس امر کو ظاہر کیا تھا کہ ہمارے اندر جو کانشنس کی آواز ہے وہ

خدا کی آواز ہے۔ یہ آواز ہمارا امتحان کرتی اور ہمیں جانچتی ہے وہ ہی سے
ہمارے خیالات جان لیتی ہے۔ اور ہمارے الفاظ سے پیشتر اس سے
کہ وہ ہماری زبان سے نکلیں وہ آگاہ ہے۔ تاریکی اور نور میں آسمان و دوزخ میں
ہمارا تعاقب کرتی ہے۔ حق کا حکم دیتی ناحق کے لئے ملامت کرتی ہے تو
یہ آواز سوائے اُس لاانتہا وجود کے کس کی ہوگی جس نے ہمیں اور سارے
جہان کو ایسے عجیب اور دہشت ناک طور سے بنایا اب ہم ایک درجہ اور آگے
بڑھیں۔ فرض کرو کہ یہ آواز نہ صرف تمہارے اندر ہے بلکہ تمہارے باہر بھی
ہے اور تم سے انسانی لہجہ میں متکلم ہے۔ اس کی آنکھیں تم کو دیکھ رہی ہیں اُس
کے عجیب کام آنکھوں کے سامنے ہو رہے ہیں اور نہ صرف تمہارے دل میں
بلکہ تمہارے ساتھ بطور رفیق کے حاضر ہے تو یہ مجسّم کانشنس ہوگا پھر تم کو
معلوم ہوگا کہ اُس کی کیسی تعظیم تم کو کرنی چاہیئے۔ اناجیل سے صاف یہ پایا
جاتا ہے کہ ہمارے خداوند کے الفاظ اور اُس کی نظروں و کاموں کا مردوں عورتوں
پر اسی قسم کا عجیب اثر ہوا۔ جب اُس کی ملاقات نتنائیل سامری عورت
نکودیمس یا رسولوں سے ہوئی تو اس نے ان کے گہرے خیالوں کو دریافت کرلیا
اور وہ فوراً یعقوب کی طرح فرشتے کے ساتھ کشتی کرنے میں مغلوب ہوگئے۔ الغرض
کانشنس کا جو دعویٰ ہمارے دلوں میں ہے حقیقی دعویٰ مجسّم کانشنس کا ہمارے
سامنے ہے۔ جنہوں نے اپنے تئیں ایسے شخص کے حضور میں پایا جو ہر قول اور
فعل میں ان کا حاکم عادل منکشف ہوا تو انہوں نے اُس کی اُسی قدر اطاعت
کی جس قدر وہ اپنے اندرونی کانشنس کی اطاعت کرتے تھے۔ یہ تو پہلا قدم تھا
لیکن جب انہوں نے یہ بھی معلوم کیا کہ اس شخص کو جس میں ان کا عین کانشنس
مجسّم معلوم ہوتا تھا وہ قدرت بھی حاصل ہے جو کانشنس کے خدا کو حاصل ہونی

چاہئے جب انہوں نے دیکھا کہ فطرت کے عناصر بھی اس کی مانتے ہیں۔ اور اُس کے احکام اخلاقی مقاصد کے لئے تھے تو قدرت حکمت احسان کے اس خاص ظہور کے ذریعہ انہوں نے تسلیم کرلیا کہ یہ ہماری روحوں کا اور جہان کا حاکم ہے اور دوسروں کی طرح انہوں نے بھی اُسے اپنا خداوند اور اپنا خدا مان لیا۔

یوحنّا کی انجیل کے پہلے باب میں اس ٹھیٹ عملی یقین کا بیان ہے نہ کسی خیالی منطقی دلیل کا۔ یونانی لفظ لوگاس کا ترجمہ کلام کیا گیا ہے۔ شاید اس کے ذریعہ اصل لفظ کا پورا زور ظاہر نہیں ہوتا۔ یونانیوں کے نزدیک لفظ لوگاس سے محض ایسا کلام یا کلمہ مراد نہ تھا جو آدمی کے مُنہ سے نکلے۔ بلکہ وہ خرد و عقل جس سے یہ کلام صادر ہوتا ہے۔ الغرض اس لفظ میں اعلےٰ عقلی اخلاقی اصول گویا کُوٹ کر بھر دیئے گئے ہیں یعنی انسان کی علمی و عملی عقل کے اصول۔ یا یہ کہو کہ یہ کلام کانشنس اور عقل کا کلام ہے اور جب میں نے مجسم کانشنس کا ذکر کیا تو میں نے مقدس یوحنّا کے اس جملے کے معنے بتائے کہ "کلام مجسم ہوا"۔ جب یوحنّا نے یہ لکھا کہ "ابتدا میں کلام تھا کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا" تو وہ میرے خیال میں ایسی دلیل کو پیش کر رہا تھا جس کا میں نے ذکر کیا ہے "ساری چیزیں کانشنس اور عقل کے اس کلام کے ذریعہ بن گئیں اور کوئی چیز بغیر اس کے نہ بنی" یعنی خداوند اپنی ساری راہوں میں راستباز ہے اور اپنے سارے کاموں میں مقدس ہے"۔ اور اس راستبازی اور سچائی کے بغیر جہان کا کوئی حصہ نہ بنا۔

پس ہم یہ سمجھیں کہ انسان کا کانشنس الٰہی عقل و راستبازی کا عکس ہے "زندگی اُس میں تھی اور وہ زندگی انسان کا نور تھی" یا بقول پولوس رسول "اُس سے ساری چیزیں جو آسمان اور زمین پر ہیں دیکھی اور اندیکھی کیا تخت کیا

حکومتیں کیا ریاستیں کیا مختاریاں پیدا کی گئیں ساری چیزیں اُس سے اور اُس کے لئے پیدا ہوئیں اور وہ سب سے آگے ہے اور اُس سے ساری چیزیں بحال رہتی ہیں"۔ یہ وہ بھید ہے جو بقول پولوس شروع سے خدا میں چھپا تھا جس نے ساری چیزوں کو یسوع مسیح کے وسیلے پیدا کیا۔ یوحنّا اور پولوس رسول محض ایسے بھیدوں کا ذکر نہیں کرتے جو انسان کی فہم سے پرے ہوں۔ کہ وہ انسان کے اُسی عقیدہ کی تشریح تصدیق کرتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اخلاق فطرت میں ہے۔ چنانچہ رسول پہلے تو مسیح کی الوہیت کے بارہ میں اپنے عقیدہ کی تصدیق کرتا ہے اور پھر وہ دوسروں سے بھی یہی درخواست کرتا ہے کہ ایسا عقیدہ رکھیں کیونکہ جس نور نے اُس کی ہستی کو منور کر دیا یہ وہی نور تھا جو دنیا میں آئے ہوئے ہر ایک شخص کو روشن کرتا ہے۔ انجیل نویس کا یہ مکاشفہ اُسی روئت کی کافی تکمیل ہے جس کا ذکر ۱۳۹ مزمور میں ہوا ہے۔ یعنی کانشنس کے خدا کا۔ جو انسان اور فطرت کا بھی خدا ہے۔ اس لئے رسول یہ کہے بغیر نہ رہ سکتا تھا کہ اُس نے زندگی کے کلام کو دیکھا سُنا اور چھوا۔ ابدی زندگی کی اصلی حالت دیکھنا سُننا اور چھونا تو ناممکن ہے اور محض گناستک لوگوں کا وہم ہے۔ لیکن یوحنّا نے انسان کی اس حِس اخلاقی کو مدنظر رکھا اس لئے عقل اور کانشنس کی شہادت کو پیش کرتا ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جب تک یونانی زبان کا زور رہا قدیم کلیسیائی بزرگوں نے بھی اس کا یوں ہی ذکر کیا ہے۔ مثلاً جسٹن شہید نے دوسری صدی کے وسط میں یوں بیان کیا ہے کہ "جو لوگ عقل اور کلام کے مطابق چلتے ہیں وہ مسیحی ہیں گو اُن پر یہ الزام لگایا جائے کہ وہ دہریہ ہیں کسی خدا کی عبادت نہیں کرتے جیسے سقراط وغیرہ۔ جو حق بات کسی نے کہی ہو وہ ہم مسیحیوں کی ملکیت ہے۔ کیونکہ ایسے مصنف

دھندلا سا دیکھتے تھے بذریعہ اس کلام کے جو اُن کے اندر بویا گیا تھا۔

پولوس اور یوحنا جیسے یہودیوں کے دل اس مشاہدہ سے قائل ہو گئے اور انہوں نے مان لیا کہ مسیح ضرور خدا کی مجسم حکمت سچائی اور راستبازی ہے۔ مختلف اشخاص پر مختلف طریقوں سے یہ اثر پیدا ہوا کسی پر معجزوں کے ذریعہ سے کسی پر اخلاقی دلائل سے اور ان دونوں قسم کی دلائل کو اکٹھا رکھنا چاہئے کیونکہ قدرت بِلا نیکی کچھ نہیں اور نیکی بلا قدرت کے ناقص ہے۔ اس خالق میں یہ دونوں صفات ہیں اور انسان کے دل پر ان دونوں کی تاثیر ہوتی ہے چنانچہ مقدس پولوس مختصراً اس کا یوں ذکر کرتا ہے کہ "مقدس روح کی نسبت قدرت کے ساتھ اس کے جی اٹھنے کے بعد خدا کا بیٹا ثابت ہوا" یعنی کافی دلیل قدسیت کی روح مع قدرت کے ہے۔

ایک جرمن فیلسوف نے یہ کہا کہ "دو امور انسان کے دل میں ایک نئی روز افزوں تعریف اور خوف پیدا کرتے ہیں۔ اول تو ستاروں بھرا آسمان۔ دوم دلی اخلاقی شریعت"۔ اس مصنف سے تین ہزار پہلے زبور کے مصنف نے بھی کہا تھا کہ دل میں خدا کی شریعت ویسی ہی عجیب ہے جیسے جہان میں "آسمان خدا کا جلال بیان کرتے ہیں اور فضا اُس کی دستکاری دکھاتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ خداوند کی شریعت کامل ہے کہ دل کے پھیرنے والی ہے" اگر آجکل اسباب موجودات کی شان دل پر اثر کرتی ہے تو جن پاک دل لوگوں میں ہمارا خداوند رہتا سہتا تھا اُن کے دلوں پر روحانی جہان کے مکاشفہ سے کیسی بڑی تاثیر ہوئی ہوگی۔ یسوع مسیح نے کہا تھا کہ "پاک دل لوگ خدا کو دیکھیں گے" اور انجیل اور ہمارا خداوند ایسی روحانی رویت کی طرف اشارہ

کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اناجیل اور خطوط میں مسیحی عقیدہ اور مسیحی زندگی کا خلاصہ یہ ہے کہ یسوع مسیح کو خدا اور انسان دونوں مانیں۔ انہوں نے یہ معلوم کر لیا کہ کوئی شخص بلا روح القدس کے یسوع کو خداوند کہہ نہیں سکتا۔ اس عقیدہ کے پورے معنے اس وقت بخوبی ظاہر تھے جب مسیحی دین کو لوگ یوں اخلاقی طور پر قائل ہو کر مانتے تھے نہ جیسے آجکل محض روایت کے طور پر جو باپ دادوں سے چلی آئی ہو۔ جب پولوس رسول نے یہ کہا کہ "یسوع مسیح پر ایمان لا تو تو نجات پائیگا" تو ان کا یہ مطلب نہ تھا کہ اس کو بطور مسئلہ کے مانیں بلکہ وہ یہ چاہتا تھا کہ ہم اپنے کانشنس اور عقل سے اُس کو تسلیم کریں جس کی تاثیر اُن کے دلوں میں ہوئی اور متواتر ان کو نیا بناتی تھی۔

انجیل کا یہ لُبّ لباب ہمیشہ یکساں رہتا ہے۔ اگر ہم خداوند یسوع مسیح کو اپنا خدا دل اور عقل کی شہادت کے زور سے تسلیم کریں تو ویسی ہی تاثیر ہماری زندگی میں ظاہر ہوگی۔ اوّل۔ جہاں تک ہم خدا کو راستبازی اور سچائی تسلیم کرتے ہیں۔ دوم۔ جہاں تک ہم یسوع مسیح کو اُس اخلاقی روحانی راستبازی کا کامل مجسم مانتے ہیں وہاں تک ہمارا ایمان زندہ ہے۔ مسیح کی سیرت خدا کی سیرت ہے اور ان دونوں کو ایک سمجھتے خدا کا علم اور خدا کے ساتھ رفاقت حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے رسول نے کہا کہ "جو کوئی اقرار کرتا ہے کہ یسوع خدا کا بیٹا ہے خدا اُس میں اور وہ خدا میں بستا ہے"۔ پس اس کا ضروری نتیجہ یہ ہے کہ انجیل کی وہ ساری تاثیریں ہوں اور وہ شراکت اور رفاقت حاصل ہو جس کے ذریعہ ہمارا مسیح کے ساتھ اتحاد ہوتا ہے۔ ہمارے نجات دہندہ نے فرمایا "اگر آدمی مجھے پیار کرے تو وہ میری باتوں پر عمل کرے گا اور میرا باپ اُسے پیار کرے گا اور ہم اُس کے پاس آئینگے اور اپنا مسکن اُس

کے ساتھ بنائیں گے" جس قدر ہم اُسے پیار کرتے ہیں اُسی قدر ہم اُس کے حکموں پر عمل کریں گے اور جس نسبت سے اس کے فضل اور سچائی کو ہم نے قبول کیا ہے اُسی نسبت سے اُس کی محبت ہمارے دلوں میں ہوگی۔ "ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ تجھے اکیلا سچا خدا جانیں اور یسوع مسیح کو جسے تو نے بھیجا ہے" ٭

چھٹا لکچر

مکاشفہ کی عام شہادت

"خدا جس نے اگلے زمانے میں نبیوں کے وسیلے باپ دادوں سے بار بار اور طرح بہ طرح کلام کیا ان آخری دنوں میں ہم سے بیٹے کے وسیلے بولا"۔ (عبرانی ۱: ۱ و ۲) ٭

گذشتہ لکچر میں اُس ایمان کی تشریح کی گئی جس کے ذریعہ رسولوں اور شاگردوں نے خداوند یسوع مسیح کو باپ کا اکلوتا تسلیم کرلیا اور مان لیا کہ وہ زندگی اور سچائی کا ازلی کلام تھا جو جسم میں ظاہر ہوا اور ہمارے درمیان رہا۔ اگر وہ تشریح درست ہو تو اصولاً ساری مسیحی بنیاد کو سنبھالنے کے لئے کافی ہوگی جب مسیح سے ایسی سیرت منسوب کی گئی تو اُس کی تعلیم کی سند ماقبل اور مابعد دونوں پر حاوی ہے۔ اس لئے اب میں مسیح کے اقوال کی

تشریح کرونگا مسیحی زندگی اور تعلیم کے عام مقاصد کے لئے یہ بیان کافی ہوگا۔ ہمعصر اور تواریخی شہادت جس کے ذریعہ ہمارے خداوند کی الوہیت پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے بحیثیت مجموعی کل الٰہی مکاشفہ کے سمجھنے کے لئے ضرور ہے۔ لیکن مکاشفہ اور تواریخ کے دوسرے امور کی تفصیل سے پیشتر اگر مسیح کی اپنی شخصیت اور اُس کے اقوال سے اس کے دعاوی کافی طور سے ثابت نہ ہوں تو وہ ابن آدم ثابت نہ ہوگا نہ ہر ملک اور زمانے کے لوگوں پر اُن کا اثر ہوگا مقدس یوحنا اپنے پہلے خط میں اور اپنی انجیل کے شروع میں انسانی تجربہ انسانی عقل اور انسانی کانشنس کو مخاطب کرتا ہے۔ نہ ایسی بات پیش کرتا ہے خواہ کیسی سچی ہو جو دلائل کے سلسلہ سے ثابت ہوسکے بلکہ ایسی بات جسے اُس نے سُنا جسے اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ جس پر اُس نے نظر کی جس کو اُس کے ہاتھوں نے چھُوا۔ یہ زندگی کا کلام تھا۔ جیسا ہم نے دیگر مسائل کے بارہ میں ظاہر کیا ویسا ہی انجیل کے بارہ میں کہتے ہیں کہ اس کی بنیاد نہ عقلی دلائل پر بلکہ انسان کی اخلاقی ساخت اور فطرت پر ہے۔ مگر اس وقت میرا یہ منشا نہیں کہ اس عام سچائی سے محض دین کی صداقت ثابت کروں بلکہ خاص باتوں کا ذکر کروں اور بتاؤں کہ وہ عقل کے مطابق ہیں اور ہمارے ماننے کے قابل ہیں ٭

عبرانیوں کے خط کا مُصنّف باب کے شروع ہی میں اس خاص دعوٰی کو پیش کرتا ہے جس کو آجکل لوگ "فوق الفطرت دین" کہتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ہم سے اپنے بیٹے کے وسیلے متکلم ہوا بلکہ وہی خدا مختلف اوقات میں مختلف طریقوں سے گذشتہ زمانہ میں نبیوں کے ذریعہ ہمارے آباو اجداد سے متکلم ہوا۔ کلیسیا مکاشفہ کا ایک سلسلہ پیش کرتی ہے جو قدیم زمانوں سے انسان

کو خدا کی طرف سے ملتا رہا ہے یعنی نوح و ابراہیم کے دنوں سے لے کر مسیح اور اُس کے رسولوں کے ایام تک۔ اب لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ جن لوگوں کو یہ مکاشفات ملے ان کو کس طرح یقین ہوا کہ یہ خدا کی طرف سے مکاشفے تھے؟ یہ جواب دینا خواہ ایک طرح سے درست ہی ہو کافی نہ ہوگا کہ جس خدا نے ان کو یہ مکاشفے دیئے اُس خدا نے اعجازی طور پر اُن کو یقین دلا دیا کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں۔ ایسے جواب پر تکیہ کرنے سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ ہم اپنے عقیدہ کی کوئی دلیل نہیں دے سکتے یا یہ کہ ہمارے عقیدہ کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ مقدس نوشتوں کا بھی یہ دستور نہیں بلکہ یہ بیان کرتے ہیں کہ جنہوں نے ان مکاشفات کو منجانب اللہ قبول کیا انہوں نے ایمان سے قبول کر لیا یعنی اُن کے دلوں نے اُن مکاشفات کو اپنی روحانی اور اخلاقی تقاضوں کے مطابق پایا اِس لئے انہوں نے مان لیا کہ یہ اُن کے خدا کی طرف سے ہیں لکھا ہے کہ "ابرہام ایمان لایا اور یہ اُس کے لئے راستبازی گنا گیا" (یہ ایمان کی راستبازی کا اظہار تھا) "اور خلیل اللہ کہلایا" چنانچہ عبرانیوں کے خط کے گیارہویں باب میں بزرگوں نبیوں کی مثالیں پیش کی گئی ہیں کہ ہمارے جیسے انسان تھے لیکن ایمان کے ذریعہ ان مکاشفوں کو قبول کر لیا اگرچہ اُن کو رد کرنے کے واسطے سخت آزمائش تھی مثلاً "موسیٰ نے سیانا ہو کر فرعون کی بیٹی کا بیٹا کہلانے سے انکار کیا کہ اُس نے خدا کے لوگوں کے ساتھ دکھ اُٹھانے کو اس سے زیادہ پسند کیا کہ گناہ کے چند روزہ لطف کو حاصل کرے"۔ ویسا ہی نوح نے دنیا کو ملزم ٹھیرایا اور اُس راستبازی کا جو ایمان سے ملتی ہے وارث ہوا۔ اُس سے ظاہر ہے کہ ان مکاشفات کی بنا اخلاقی اصول پر ہے ۔

یاد رہے کہ جن اصولوں پر ہم نے مسیح کو قبول کیا تھا وہ سارے دائرہ مکاشفہ پر محیط ہیں ان کے ذریعہ مکاشفہ کا نہ صرف امکان ثابت ہوتا ہے بلکہ ظن غالب پیدا ہوتا ہے۔ وہ اصول یوحنا کے ان بیانات میں پائے جاتے ہیں کہ عقل و راستبازی کا کلام۔ اخلاقی اور عقلی سچائی کا کلام ابتدا میں خدا کے ساتھ تھا اور کوئی چیز بغیر اُس کے نہ بنی تھی۔ یہ بیانات جو ایسے سادہ ہیں انسانی کانشنس کی اُس آواز کی گونج ہیں جو مزمور ۱۳۹ کے مطابق اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ انسان اخلاقی مقصد کے لئے بنا ہے اور اس سے یہ ایمان پیدا ہوتا ہے کہ جس جہان کا انسان ایک جز ہے وہ بھی اخلاقی اور روحانی مقصد کے لئے بنا ہوگا اور اس میں کچھ شک نہیں کہ اخلاقی عالم طبعی عالم سے برتر ہے یہ آسمان جو خدا کے ہاتھ کی صنعتیں ہیں خواہ کیسے عجیب ہوں۔ یہ چاند و ستارے جو خالق نے مقرر کئے ہیں خواہ کیسے حیرت انگیز ہوں۔ لیکن جو لوگ جسامت کا لحاظ نہیں کرتے ان کے نزدیک انسان کی روح اُن سے بھی زیادہ عجیب و حیرت انگیز ہے جو اجرام فلک کے قوانین اور رشتوں کو دریافت کر لیتی اور ان کے اخلاقی مقصد کو تلاش کر لیتی ہے۔ مقدس یوحنا بائبل کے ابتدائی مکاشفہ کو گویا دُہراتا ہے "خدا نے کہا آؤ ہم انسان کو اپنی صورت اور اپنی مانند بنائیں کہ وہ زمین پر سرداری کرے"۔

اس زمانہ میں ایسی اعلےٰ ردشت کو بگاڑ نہیں سکتے۔ سائنس نے یہ بڑا کام کیا ہے کہ اُس نے اِن الفاظ کی پوری تصدیق کی ہے "پھلو اور بڑھو اور زمین کو معمور کرو اور اُس کو محکوم کرو"۔ اگر سائنس نے یہ کام پورا کیا ہے تو یوحنا کے الفاظ میں اس سے بھی اعلےٰ بیان ہے کہ "ابتدا میں لوگاس (عقل۔ نطق۔ کلام) تھا اور بغیر لوگاس کے کوئی چیز نہ بنی" فیلسوف کی ساری

محنتوں میں یہ عقیدہ اُس کو قوت بخشتا ہے کہ فطرت میں کوئی ایسی شے نہیں جو عقل کے مطابق نہ ہو۔ اس لئے یوحنا کے الفاظ میں سائنس کا اصول قائم ہوا ہے۔ اور جہاں کہیں لوگوں نے خدا کی یگانگت عقل اور کانشنس سے تسلیم کی ہے وہاں ہی ایسے خیالات نے مستقل طور پر ترقی کی ہے۔ محمدی دین میں خدا کی مرضی پر زور ہے نہ خدا کی حکمت پر۔ اس لئے محمدی ایک اٹل تقدیر کو مانتے ہیں اور فطرت کے بھیدوں کو دریافت کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ جو عقل ہم بقول یوحنا فطرت کے الہٰی انتظام سے منسوب کرتے ہیں اُس میں اخلاقی اور عقلی اصول داخل ہیں۔ اس لئے ہم آنکھیں کھول کر نہ صرف طبعی جہان کی معقول ترتیب کو دیکھیں بلکہ اُس کی اخلاقی اور روحانی ترتیب پر بھی نظر ڈالیں۔ سائنس میں اور نیز مذہب میں ہم اپنی تحقیقات اس اصول موضوعہ سے شروع کرتے ہیں کہ انسان خدا کی صورت پر بنا ہے۔ نہ صرف اسباب موجودات میں بلکہ انسان کے دل میں بھی اُس روحانی اور دائمی وجود کا عکس پایا جاتا ہے۔ مکاشفہ پر جو غیر طبعی ہونے کا الزام بلحاظ اس کے فوق الفطرت ہونے کے لگایا جاتا تھا وہ دور ہو جاتا ہے۔ اور مکاشفہ کا ظن غالب پیدا ہو جاتا ہے نہ اس لئے کہ جن باتوں کو یہ ظاہر کرتی ہے وہ ایسے فاصلہ پر ہیں بلکہ یہ کہ وہ ایسی نزدیک ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ہمیں اپنا عقیدہ محض حکم پر بنانا پڑتا ہے بلکہ اس لئے کہ یہ عقیدہ ہمارے کانشنس اور عقل کے ایسے مطابق ہے۔ جن باتوں کی ہم تلاش کرتے ہیں وہ ہم میں سے کسی سے دور نہیں اور جب وہ حجاب اُٹھ جاتا ہے تو ہم ایک اجنبی اور نامعلوم ملک میں اپنے تئیں نہیں پاتے بلکہ ایسی سرزمین میں جسے مدتوں خواب میں دیکھتے رہے ہیں۔ دین کی سچائی کا یہ اصلی جزو ہے۔ انسان کا دل اور عقل خدا کے ارادہ اور حکمت

سے شراکت رکھتے ہیں گو یہ شراکت دھندلی سے ہو۔ اور یہ طبعی بات ہوگی کہ جب کوئی مکاشفہ خدا کی طرف سے ملے تو انسان فوراً اُس کو تسلیم کرے۔ لفظ فطرت یا نیچر کے اب تک غلط معنی لئے جاتے ہیں حالانکہ برسوں پہلے بشپ ٹیلر نے اس غلطی کو مٹا کر اس کے اصل معنی بنا دئے تھے۔ اگر کچھ کبھی کبھی مسیحی دین کی صداقت میں یہ بات پیش کی جاتی ہے کہ گو یہ فطرت انسان کے عین مطابق ہے اس لئے اس کا دعویٰ پُرزور اور اس کے منجانب اللہ ہونے کا پختہ ثبوت ہے۔ مثلاً ابتدائی کلیسیا میں جب شہیدوں نے ہر طرح کے ظلم اور دُکھ اُٹھائے لیکن اپنے مالک اور آقا کا انکار نہ کیا تو یہ ان کی فطرت کے زیادہ مطابق تھا بہ نسبت اس بات کے کہ وہ اُس بدی اور تن پروری کی طرف مُڑتے جس سے وہ آزاد ہو چکے تھے۔ ویسا ہی جو رُوئتیں الہٰی باتوں کے بارہ میں ہمیں ملی ہیں اُن میں ایسی کشش ہماری روحوں کے لئے ہے کہ ہمیں ان کا دعویٰ ماننا پڑتا ہے کیونکہ وہ عقل فضل اور سچائی کے مکاشفے ہیں +

ان بیانات سے یہ تو ظاہر ہوا کہ مکاشفہ روحانی باتوں پر سے ایک پردہ کو اُٹھا دیتا ہے اب ایک اور بات اس کے متعلق ہے جس کی تشریح درکار ہے۔ جن مکاشفوں کا ذکر بائیبل میں ہوا ہے وہ دس احکام کی طرح محض اخلاقی احکام نہیں اور نہ ثالوث کے مسئلہ کی طرح روحانی حقیقتیں ہیں بعض اوقات امور واقعی کا بیان ہے جو تجربہ سے زندگی کی تربیت کے ساتھ مطابق ثابت ہوا۔ مثلاً جو وعدے ابرہام سے کئے گئے ان پر اُس کی زندگی کا سارا دارومدار رہا۔ انہیں وعدوں پر ایمان رکھنے کے باعث پولوس رسول اُسے سارے ایمانداروں کا باپ کہلاتا ہے جس کی نسبت اُس نے یہ کہا "وہ نااُمیدی

کی جگہ میں اُمید کے ساتھ ایمان لایا تاکہ وہ اس کلام کے موافق کہ تیری نسل ایسی ہوگی بہت قوموں کا باپ ہوا . . . . . . وہ بے ایمانی سے خدا کے وعدے میں شک نہ لایا بلکہ اعتقاد میں مضبوط ہوکر اُس نے خدا کی بڑائی کی اور اُسے کامل یقین ہوا کہ جو کچھ اُس نے وعدہ کیا سو اُسے پورا کرنے پر قادر ہے - اسی واسطے یہ اس کے لئے راستبازی گِنا گیا" پھر اس کے بعد پولوس نے یہ کہا "صرف اُس کے لئے نہیں لکھا کہ یہ اس کے واسطے گِنا گیا بلکہ ہمارے لئے بھی جن کے واسطے گنا جائیگا اگر ہم اس پر ایمان لائیں جس نے ہمارے خداوند یسوع کو مُردوں میں سے جلایا" - ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ پولوس کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ دراصل مسیحی ایمان میں اور ابرہام کے ایمان میں جو وعدوں پر تھا کوئی فرق نہیں - شاید کوئی یہ پوچھے کہ ابرہام کا ایمان آئندہ پیشین گوئی کے بارہ میں راستبازی کی وہی اخلاقی سیرت نہیں رکھتا جو مسیح کی شخصیت پر ایمان رکھنے میں پائی جاتی ہے - فرض کرو کہ رویت کے ذریعہ یا کسی آواز کے ذریعہ خواب میں یا رات کی رویت میں جب آدمی گہری نیند میں سوتے ہیں یا دن کے وقت کسی اور عجیب طریقے سے ابرہام کے دل پر یہ باتیں ظاہر ہوئیں - کس طرح سے اس نے سمجھا کہ ایسی وجود کا کلام ہے جس پر اُسے ایمان لانا اور توکّل رکھنا فرض ہے +

گذشتہ لکچر میں جیسا ظاہر کیا گیا فرض کرو کہ جو زندگی ہمارے خداوند کی طرح انسانی صورت میں ظاہر ہوئی رسولوں نے جسے دیکھا جس کی آواز سُنی جسے انہوں نے چھُوا وہ وہی ازلی زندگی اور کانشنس کا نور تھا - لیکن اس کا کیا ثبوت ہے کہ ابرہام موسیٰ یا مابعد انبیاء نے جو رویتیں دیکھیں اور آئندہ کا حال بیان کیا اُس کو وہ خود خدا کی طرف سے قبیں - اس میں کچھ

کلام نہیں کہ یہ ایمان ایک طرح کے دلی یقین کے ذریعہ ان کو ہوگیا - پولوس کی زندگی سے بھی اس کی تشریح ہوتی ہے - خود پولوس نے اُن کا ذکر کیا ہے اس کے رجوع لانے سے لے کر جب ہمارا خداوند اُس پر اعجازی طور سے ظاہر ہوا رویتیں روحانی ہدایتیں اُسے ملتی رہیں کہ اُسے خاص خاص موقعہ پر کیا کرنا چاہیئے اور اُس پر نہ صرف اخلاقی باتیں ظاہر ہوئیں بلکہ ہمارے خداوند کی ذات اور کلام کے بارہ میں عجیب باتیں اس پر منکشف ہوئیں - کن وسائل سے ایسی شہادت کی تصدیق ہوسکتی ہے +

پولوس رسول نے ابرہام کے ایمان اور مسیحیوں کے ایمان میں جو خداوند پر ہے مقابلہ کیا ہے - اس مقابلہ پر غور کرنے سے مذکورہ بالا سوال کا جواب ملتا ہے - اس کا زور اس پر موقوف ہے کہ یہ کانشنس پر اثر کرتا ہے اور کانشنس خدا کی طرف سے ابتدائی مکاشفہ ہے - اس کا بھی ذکر ہوا تھا کہ داؤد اس لئے خدا پر ایمان لایا کیونکہ اس کا کانشنس برابر اُس کو یہ جتاتا رہا کہ تیرا تعلق ایک راستباز ارادہ سے ہے - مقدس یوحنا نے بھی یقین کیا کہ مسیح خدا ہے کیونکہ اُس نے مسیح میں راستبازی سچائی اور قدرت مجسّم دیکھی - پطرس آرکوں اور نبیوں نے بھی اپنی رویتوں کو منجانب اللہ اسی قسم کی دلیل پر مان لیا - اگر یہ رویتیں اور الہام محض طبعی تاثیریں یا عقلی تاثیریں ہوتیں تو ان کو مان تو لیتے اور اگر شہادت سے اُن کی تصدیق ہوتی تو وہ دوربینی اور روشن ضمیری کا نتیجہ سمجھے جاتے - لیکن ان کے ذریعہ ایسے فرض کا خیال پیدا نہ ہوتا جو نبیوں کے دلوں میں ایمان کے ذریعہ پیدا ہوا - معجزوں کے ذریعہ بھی فرض کا ایسا خیال پیدا نہ ہوتا کیونکہ قدرت خواہ کسی قسم یا درجہ کی ہو جب تک وہ قدرت ہی ہے وہ عقل کو قائل کرسکتی ہے لیکن دل کو قائل نہیں کرسکتی - لیکن فرض کرو کہ یہ رویتیں اور معجزے جو اُن کے

ساتھ ظاہر ہوئے ہمیشہ اخلاقی تاثیرات سے ملحق تھے اور فرض کرو کہ وہ محض وقوعے ہیں لیکن ایسے وقوعے جن کا تعلق اخلاقی تربیت سے تھا۔ اور ان کا رشتہ ایسی ہدایات سے تھا جو کانشنس سے تعلق رکھتی ہوں۔ تب ہم کو پتا لگے گا کہ ان رویتوں اور اسبابوں کی اطاعت دراصل کانشنس کی اطاعت تھی۔ خوابوں کی تعبیر کے بارہ میں لوگوں نے یہ قصہ بیان کیا ہے کہ جو خواب سینگ کے پھاٹک کی راہ سے آتے ہیں وہ سچے ہوتے ہیں اور جو ہاتھی دانت کے پھاٹک کی راہ سے آتے ہیں وہ جھوٹے ہوتے ہیں۔ ویسا ہی فرض کرو کہ بزرگوں اور نبیوں کی زندگی میں ان کی ساری رویتیں کانشنس کے پھاٹک کی راہ سے ملیں نہ محض قوت متخیلہ کے پھاٹک سے۔ موخر الذکر رویتوں کے لئے تو عقلی تحقیقات درکار ہے لیکن مقدم الذکر کے لئے اخلاقی اطاعت ضرور ہے یا جیسے دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان پر ایمان لانا فرض ہے۔

بائبل میں جن مکاشفات کا ذکر ہے وہ اول سے آخر تک اس قسم کے ہیں۔ جو مکاشفہ نوح کو ملا اس کے شروع میں یہ الفاظ آتے ہیں "تو اور تیرا سارا گھرانا کشتی میں داخل ہو۔ کیونکہ اس پشت میں تجھی کو میں نے اپنے سامنے راستباز پایا"۔ اس مکاشفہ کا تعلق ایک بڑی اخلاقی عدالت سے ہے۔ اسی لئے مصنف خط عبرانیوں نوح کی نسبت نہ صرف یہ کہتا ہے کہ وہ ایسا شخص تھا جسے آئندہ کی رویت عطا ہوئی بلکہ وہ راستبازی کا منادی تھا، اور دنیا پر الزام لگاتا تھا۔ یوں وہ اس راستبازی کا وارث ہوا جو ایمان کے ذریعہ ہے۔ جب راستبازی کی یہ امانت سپرد ہوئی خداوند نے اس کو اپنے وطن اپنے رشتہ داروں اور اپنے باپ کے گھرانے میں سے بلایا اور مکاشفہ یوں بیان کرتا ہے۔

خداوند ابرہام پر ظاہر ہوا اور اُسے کہا میں قادر مطلق خدا ہوں میرے آگے چل اور کامل ہو اور میں اپنا عہد اپنے اور تیرے درمیان باندھوں گا اور ابرہام کو یہ مکاشفہ ملنے کی وجہ یوں بیان ہوئی ہے "خداوند نے کہا یہ جو میں کرتا ہوں کیا ابرہام سے چھپاؤں۔ ابرہام تو یقیناً ایک بڑی اور بزرگ قوم ہوگا اور زمین کی سب قومیں اُس سے برکت پائیں گی۔ کیونکہ میں اس کو جانتا ہوں کہ وہ اپنے بیٹوں اور اپنے بعد اپنے گھرانے کو حکم کرے گا اور وہ خداوند کی راہ کی نگہبانی کرکے عدل اور انصاف کرینگے" ویسا ہی جب اسحاق کو مکاشفہ ملا تو اُس کی وجہ بھی یہی بیان ہوئی ہے "اس لئے کہ ابرہام نے میری آواز کو سنا اور میری تاکید کو میرے حکموں اور میرے قانونوں اور میری شرعوں کو حفظ کیا ہے" جس مکاشفہ کے ذریعہ پولوس رجوع لایا اُس کا وہ یوں بیان کرتا ہے "میں نے کہا اے خداوند تو کون ہے اور اس نے کہا میں یسوع ہوں جسے تو ستاتا ہے . . . کیونکہ میں تجھ پر اس لئے ظاہر ہوا کہ تجھے اُن چیزوں کا خادم اور گواہ ٹھہراؤں جنہیں تو نے دیکھا اور جو میں تجھ پر ظاہر کروں گا۔ میں تجھے بچاؤں گا اس قوم اور غیر قوموں سے جن کے پاس اب تجھے بھیجتا ہوں کہ اُن کی آنکھیں کھول دے تاکہ وہ اندھیرے سے اُجالے اور شیطان کے اختیار سے خدا کی طرف پھریں اور گناہوں کی معافی اور مقدسوں میں میراث پائیں اُس ایمان کے وسیلے جو مجھ پر ہے"۔ پولوس رسول اُس راستبازی کے لئے غیرت مند تھا جو شریعت کے وسیلے ملتی ہے لیکن اس رویت نے اُس پر ایک اعلےٰ راستبازی کا چشمہ منکشف کر دیا۔ یہ محض ایک مکاشفہ نہیں بلکہ راستباز مکاشفہ ہے جس کے ذریعہ نہ صرف اُس کو بلکہ باقی سب رویت حاصل کرنے والوں کو ایسے مکاشفہ پر بھروسہ اور ایمان لانا پڑتا ہے بعض

صورتوں میں ایسے مکاشفہ کی تصدیق کے لئے معجزہ بھی دکھایا جاتا ہے۔ لیکن اکثر معجزہ دیکھنے کی خواہش ملامت کے قابل ہے۔ چنانچہ ہمارے خداوند نے کہا کہ "اگر میں سچ کہتا ہوں تو تم کیوں ایمان نہیں لاتے" اِس سے ظاہر ہے کہ اِن کے ذریعہ اعلےٰ فرائض کو پیش کیا جاتا ہے۔ اور وہ فرض بھی نہ اِس یا اُس شخص کا بلکہ ہر شخص کا فرض ہے۔ جس نبی یا غیب بین کو یہ مکاشفہ ملا اُس نے اپنے دل میں یہ محسوس کیا کہ میں اگر ایسے مکاشفہ کو رد کرونگا تو کانشنس کے خلاف کرونگا اور جہاں تک لوگ تیار تھے انہوں نے ایسے مکاشفوں کو قبول کر لیا۔

بائیبل کے مکاشفات کی اخلاقی صورت ان کے تواریخی سلسلہ پر غور کرنے سے زیادہ ظاہر ہوتی ہے یہ درخواست یا مطالبہ ابدی اخلاقی اصولوں پر مبنی ہے۔ اخلاق کا دائرہ وسیع ہوتے ہوتے کل نوع انسان کو گھیر لیتا ہے۔ اس کا آغاز ایک خاص شخص سے ہوا "میرے آگے چل اور کامل بن" پھر وہ اس کے خاندان میں آتا ہے اور خدا ابرہام اضحاق اور یعقوب کا خدا بن جاتا ہے۔ موسیٰ کے دنوں میں یہ قوم کو احاطہ کر لیتا ہے اور جو مکاشفہ موسیٰ کی معرفت ملا وہ دس احکام میں کانشنس کو مخاطب کرتا ہے یہ احکام افراد کے قوانین نہیں بلکہ ایک امت کے قوانین ہیں۔ اس وقت سے لے کر نبیوں کے مکاشفات افراد کے اخلاق سے محدود نہیں بلکہ کل قوم کی اخلاقی تربیت سے متعلق ہیں اور یہ مکاشفات خواہ شخصی ہوں یا تمدنی یا قومی کانشنس اور اخلاقی فرض کے پھاٹک سے صادر ہوتے ہیں۔ آخر کار مقدس استیفنس اور پولوس کو جو یہودی تھے یہ یقین ہو گیا کہ مسیح کی زندگی اور کام کے ذریعہ اس کے دعاوی کی پوری صداقت ظاہر ہو گئی۔

اس لئے جب استیفنس کو اپنے ایمان کی حمایت میں کہنا پڑا تو اُس نے تواریخی شہادت پیش کی۔ جو مکاشفے اُس کی قوم کو وقتاً فوقتاً ملے تھے اُن کا وہ ذکر کرتا ہے اور اُس نے یہ بھی ظاہر کیا کہ اِن کا اخلاقی مقصد تھا اور ایک "راستباز" کے آنے کی طرف اشارہ کرتے تھے اور جب یہودیوں نے ان مکاشفات کو رد کیا تو اس کی وجہ یوں بیان کی "تم ہر وقت روح القدس کا سامنا کرتے ہو جیسے تمہارے باپ دادے تھے تم بھی ہو" یہ پہلا مسیحی معذرت نامہ یہودیوں کے سامنے پیش ہوا اور بہت پُر زور ہے۔ ایسا ہی مکاشفہ کی شہادت کا زور زمانہ بعد زمانہ بڑھتا رہا ہے۔ اب یہ امر واقعی ہے کہ مکاشفہ کے ذریعہ روحانی تقاضا پورے ہوتے ہیں نہ ایک شخص یا ایک قوم کے بلکہ کل نوع انسان کے۔ انجیل کا کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس کی بنیاد ہر شخص کے کانشنس میں نہ ہو خواہ وہ کسی قوم یا درجہ کا ہو۔ البتہ مسیحی دین میں ایسی باتیں ہیں جو کانشنس کی رسائی سے پرے ہیں اور بتدریج مکاشفات گویا اپنے زمانہ کی حالت سے ایک درجہ بڑھے ہوئے تھے رفتہ رفتہ کانشنس نے ہدایت کر کے انسان کو اُن کے ذریعہ آگے بڑھایا۔ اس لئے اُن پر ایمان لانا اور اُن کی اطاعت کرنا اخلاقی فرض ہو گیا۔

اِس لئے یہ مطالبہ کہ ایمان لانا چاہئے اخلاقی مطالبہ ہے اور ہر انسان کے لئے یہ اخلاقی کسوٹی ہے۔ ابرہام خدا پر ایمان لایا اور یہ اس کے لئے راستبازی گنا گیا۔ کیونکہ اگر وہ ایمان نہ لاتا تو وہ اپنے کانشنس سے بے وفا ٹھیرتا۔ آجکل انجیل کی یہی دعوت ہے۔ میں تو نہیں کہتا کہ جو اسے رد کرتا ہے وہ کانشنس سے بے وفا ٹھیرتا ہے۔ کیونکہ شائد دعوت اُسے اُلٹی پلٹی پہنچی یا غلط روایات کے ساتھ مل کر پہنچی

لیکن عام اصول یہ ہے کہ مسیحی دین اور اُس کے ماقبل مکاشفے منجملہ قابلِ ایمان کی دعوت کرتے ہیں کیونکہ جہاں تک اُن کو پرکھا گیا کانشنس نے اُن کی تصدیق کی اور جہاں تک وہ کانشنس کی رسائی سے اعلےٰ ہیں اُن کا ایک اخلاقی مقصد ہے اور ایک اخلاقی حد ہے۔ ہم ایمان طلب کرتے ہیں لیکن اندھا ایمان نہیں طلب کرتے۔ ہم یہ تو طلب کرتے ہیں کہ اطاعت کریں۔ اول خدا کی جو آواز ہمارے اندر ہے اُس کی اطاعت کریں اور پھر اُس آواز کی جو کانشنس کی آواز کے مطابق ہے ÷

ساتواں لکچر

مسئلۂ ثالوث اخلاقی مکاشفہ ہے

"خداوند یسوع مسیح کا فضل اور خدا کی محبت اور رُوح القدس کی شراکت تم سبھوں کے ساتھ ہو" (۲ قرنتی ۱۳: ۱۴) ÷

اب تک جس اخلاقی بنیاد پر ہمارا ایمان مبنی ہے اس کا ذکر ہوا ہے اول مکاشفہ کا دوم خاص مسیحی مکاشفہ کا۔ مثلاً مشخص خدا پر ایمان لانا تجربہ اور کانشنس کی ہدایات پر مبنی ہے۔ ویسا ہی خداوند یسوع مسیح پر ایمان لانا کیونکہ وہ ہم سے بحیثیت مجسم کانشنس کے اطاعت چاہتا ہے۔ وہ

فضل و سچائی سے بھرپور ہے۔ اس طرح ناقبل مکاشفات پر ایمان لانا بھی اخلاقی امر ہے کیونکہ ان کی صداقت بھی کانشنس سے ہوئی۔ نبی اور رسول ہمارے خداوند یسوع مسیح کی طرح ہم سے ایسی باتیں منوانی چاہتے ہیں جن کو نہ ہم دیکھ سکتے ہیں نہ آزما سکتے ہیں۔ لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں بصارت کام نہیں دیتی وہ ہم پر از قسم فرائض معلوم ہوتے ہیں محض ہمارے گہرے محسوسات کے مطابق۔ کیونکہ وہ راستبازی اور قدرت کے مجموعی ظہور پر دلالت کرتے ہیں۔ مسیحی عقیدہ محض ایسے اسرار کا ایک مجموعہ نہیں جو انسانی تجربے سے خارج ہو۔ بلکہ اُس تجربہ کی تشریح جو اصولاً کانشنس کی ہدایات کے مطابق ہے ÷

اب ایک اصولی مسئلہ باقی رہا جس کی تشریح اب ہوگی اور جس کے بارہ میں آجکل بعض خیال کریں گے کہ عملی تجربہ نہیں ہوسکتا۔ یعنی مسئلہ ثالوث۔ جن مخالفوں کے اعتراضوں کا ذکر ہوا ہے اُن کے نزدیک یہ مسئلہ محض عقلی اور قیاسی ہے حالانکہ ایسا مسئلہ ہماری عقل کی رسائی سے پرے ہے اور بہت مسیحی اشخاص بھی ایسے ہوں گے جن کو اس مسئلہ کی ایسی ضرورت محسوس نہ ہو جیسی کلیسیا نے اس مسئلہ سے منسوب کی ہے۔ مسئلہ کے سرّ یا راز سے یہ مشکل پیدا نہیں ہوتی اور نہ مشکل یہ ہے کہ آدمی ایسی باتوں کو ماننا نہیں چاہتے جو ان کی عقل کی رسائی سے پرے ہیں۔ بلکہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ایسے ایمان اور عقیدہ کے لئے کچھ عملی بنیاد اور ایک اخلاقی حقیقت اس میں ہو۔ معترضوں کو یہ مشکل پیش آتی ہے وہ کہتے ہیں کہ ایک خدا میں تین اقانیم کا تسلیم کرنا اُن کے روزانہ فرائض اور اُن کی اخلاقی زندگی میں کیا اثر کرتا ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ بہت مسیحی بھی اس مسئلہ کو مان تو لیتے

ہیں لیکن اس کی تاثیر اور ضرورت کو محسوس نہیں کرتے ۔

اس سے کم از کم اتنا تو ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حالت قدیم مسیحیوں کی طبیعت اور مزاج کے مطابق نہیں ۔ بلا اس امر پہ بحث کئے کہ فلاں نسخہ یا آیت معتبر ہے یا غیر معتبر یہ تواریخی طور پہ ثابت ہے کہ شروع ہی سے مسیحی کلیسیا میں داخل ہونے کی یہ لازمی شرط تھی کہ تثلیث فی التوحید پر ایمان لائیں ۔ اول سے لے کر آج تک مسیحیوں کو بپتسمہ باپ بیٹے اور روح القدس کے نام میں دیا جاتا ہے ۔ ایمان کا اقرار اُس نام نامی میں عقیدہ کا خلاصہ تھا جس کی اطاعت واجب و لازم تھی ۔ البتہ اُس عقیدہ کی جو تشریحات پیچھے کی گئیں اُن کے ذریعہ یہ خیال رسولی زمانہ کا کچھ دھندلا پڑ گیا ۔ رسول اِس اصول کا بار بار ذکر کرتے ہیں ۔ عام تقریروں میں برکت کے کلمات اور سلاموں میں یہ اُن کی زبان سے نکلتا ہے ۔ وہ یوں تو بیان نہیں کرتے کہ یسوع مسیح خدا ہے اور روح القدس خدا ہے تو بھی تین خدا نہیں بلکہ ایک خدا لیکن یہ ان کی عام عادت اور دستور ہے کہ خداوند یسوع مسیح اور روح القدس کا ذکر انہیں الفاظ اور رشتوں میں کرتے ہیں جن میں خدا کا ذکر کرتے ہیں تو بھی وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خداوند ان کا خدا ایک خداوند ہے مسئلہ ثالوث کا بیان الگ خاص طور سے تو نہیں کیا گیا بلکہ اس کا یہی حال ہے جیسے درخت کی جڑوں اور گھر کی بنیاد کا ۔ یہ بظاہر نظر تو نہیں آتیں لیکن بنیاد ساری انہیں پر کھڑی ہے ویسا ہی یہ تعلیم و عقیدہ ساری مسیحی عمارت کی بنیاد ہے ۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسولوں کی عقل اور دل باپ بیٹے اور روح القدس کے نام و زندگی میں بپتسمہ پا چکے تھے " نعمتیں تو طرح طرح کی ہیں مگر روح ایک ہی ہے اور خدمتیں بھی

طرح طرح کی ہیں مگر خداوند ایک ہی ہے اور تاثیریں بھی طرح طرح کی ہیں مگر خدا ایک ہی ہے جو سب میں ہر طرح کا اثر پیدا کرتا ہے "۔ شہیدوں کے اقرارات اور قدیم بزرگوں کی تحقیقات میں بھی یہ عقیدہ مسلمہ پایا جاتا ہے ۔ مابعد تواریخ سے اس عقیدہ کا اظہار کفارہ اور راستباز ٹھیرنے کی تعلیم سے ہوتا ہے اگرچہ خود عقیدہ تثلیث کچھ دھندلا پڑ گیا ہے ۔ لیکن کلیسیا کے ابتدائی زمانہ میں جس مسئلہ نے مسیحیوں میں خاص سرایت کی وہ یہ مسئلہ ثالوث تھا یعنی باپ بیٹے اور روح القدس کا باہمی رشتہ اور ان کا رشتہ تمہارے ساتھ ۔ اُن دنوں میں ساری عملی باتوں میں اس مسئلہ کا درجہ سب سے بڑا تھا ۔

اس مسئلہ کی عملی اور اخلاقی صورت کو سمجھنے کے لئے مسیحی عقیدہ کی تواریخی شہادت پر غور کرنا اچھا ہے پچھلے لکچر میں یہ ذکر ہوا تھا کہ جو مکاشفات بائبل میں قلمبند ہوئے ہیں وہ اُس نبی کی زندگی سے خاص تعلق رکھتے جس کو وہ ملے اور اُس زمانہ سے خاص تعلق رکھتے جن میں منکشف ہوئے اور اُن کی صداقت و اختیار بہت کچھ اس امر پہ موقوف تھے کہ کہاں تک ان کی مطابقت کانشنس سے تھی ۔ لیکن جب ہم خاص مسیحی دین کے مسائل کی طرف رجوع کرتے ہیں تو اس کی ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ ان کا تعلق اعلے سے اعلے اشخاص اور اپنے زمانہ کے اہم واقعات سے ہے ۔ کیونکہ اس کا تعلق نہ محض مسیح کی تعلیم سے بلکہ مسیح کی شخصیت اور زندگی سے ہے ۔ کیونکہ مسیحی عقیدہ کا مقدم اور اصلی جزو یہ ہے کہ یسوع کو ہم خدائے مجسم تسلیم کریں اور اُسے اپنا خداوند مانیں اور بدن و جان سے اُس کی اطاعت کریں جب ہم اتنا مان لیتے ہیں تو مسیح کی زندگی ہماری

اپنی زندگی کا اعلےٰ جز بن جاتی ہے۔ جو کچھ وہ خود تھا جو کچھ اُس نے کیا۔ جو کچھ وہ ہے وہ ہماری زندگی کا عین قانون ہو جاتا ہے۔ جب ہمارے نجات دہندہ نے فرمایا "تم مجھ میں قائم رہو اور میں تم میں جس طرح ڈالی اگر انگور کے درخت میں قائم نہ رہے تو اپنے آپ سے پھل نہیں لا سکتی اسی طرح تم بھی اگر مجھ میں قائم نہ رہو تو پھل نہیں لا سکتے" ان کے یہ الفاظ ان سارے رشتوں پر حاوی ہیں جو وہ ہمارے ساتھ رکھتا ہے۔ اس کا مستقل رشتہ ہمارے ساتھ بذریعہ اس کی رُوح کے ہے لیکن ہم انہیں افعال واقوال کے ذریعہ اس امر کو جان سکتے ہیں جن کو ہم نے دیکھا سنا اور چھوا۔ ہمارا کانشنس ہمیں یہ بتاتا ہے کہ ہمارا رشتہ ایک شخص خدا سے ہے لیکن یہ بات کہ اس خدا کا رشتہ ہمارے ساتھ ایسا ہے جیسا کسی دوسرے انسان سے ہوتا ہے یہ صاف تجربہ سے ثابت نہیں ہوتا لیکن یہ تواریخی امر ہے۔ جیسا ہمارے خداوند نے فرمایا "جس نے مجھے دیکھا ہے اُس نے باپ کو دیکھا ہے" ویسا ہی مسیح کی عملی زندگی میں وہ خود نظر آتا ہے۔

اس لئے مسیحی محض ایسا شخص نہیں جو یسوع مسیح پر ایمان لاتا ہے۔ کہ وہ میرا غیر مرئی خداوند اور آئندہ منصف ہے بلکہ جو اُس نور کی روشنی میں زندگی بسر کرتا ہے جو مسیح کی زندگی سے منعکس ہوتا ہے۔ اب وہ محض کانشنس کی ہدایات یا اپنے خداوند کے احکام پر ہی تکیہ نہیں کرتا مسیح کی زندگی بذات خود ایک مکاشفہ ہے جو مسیحی کی زندگی اور خیالات پر برابر اثر کرتا ہے ایک طرح سے یہ سارے آدمیوں کا حال ہے خواہ وہ مسیحی ہوں یا نہ ہوں۔ انسان اور خدا کی ذات کے مسائل کا بیان بلا مسیح کی زندگی کے کرنا نہ صرف مسیحی دین کے خلاف بلکہ عقل اور سائنس کے خلاف ہے۔ انسانی تجربہ

میں مسیح کی زندگی ایک امر واقعی ہے اور اس کی تشریح تو کرنی پڑے گی خواہ مسیحی تشریح کو جو اس کے بارہ میں ہے کوئی قبول کرے یا نہ کرے اُس زندگی سے قطع نظر کر کے ایسے طور پر ہم زندگی بسر نہیں کر سکتے اور عمل نہیں کر سکتے کہ گویا ایسا کوئی واقعہ گذرا ہی نہیں اور اس کے ساتھ کچھ تعلق بھی نہیں۔ اناجیل بلا مسیحی کلیسیا کی وساطت کے اُس زندگی کو ایسے طور پر پیش کرتی ہیں کہ نوع انسان کے خیالات اور تمیزوں پر اُس کی تاثیر ہوتی ہے اور جو سوالات اور خیالات ان کے ذریعہ سے پیدا ہوتے ہیں اُن سے گریز نہیں کر سکتے۔ ان کو رد کر سکتے ہیں لیکن ان سے قطع تعلق نہیں کر سکتے۔ مسیحی شخص کی یہ خاصیت ہے کہ وہ اپنے خداوند میں قائم رہے یعنی اپنے خداوند کی زندگی خیال اور کام کے مطابق زندگی بسر کرے سوچے اور عمل کرے۔

اس بیان کو یاد رکھ کے ہم مسئلۂ تثلیث کی اخلاقی بنیاد کو مختصر الفاظ میں بیان کر سکتے ہیں۔ یہ مسیح کی زندگی کی تشریح ہے۔ یہ مکاشفہ تو ہے لیکن نہ محض اس معنے میں مکاشفہ کہ یہ ایسا مسئلہ ہے جسے ہم خود دریافت نہ کر سکتے تھے وہ خدا نے ہم پر بذریعہ الہام ظاہر کر دیا بلکہ ایسا مکاشفہ جو انسانی تواریخ اور تجربہ کے خاص امور سے پیدا ہوا ہے۔ جن وجوہات کا ہم ذکر کر چکے ہیں ان کے لحاظ سے ہم مانتے ہیں کہ خداوند یسوع مسیح خود خدا تھا لیکن اُس نے یہ بھی ذکر کیا کہ خدا میرا باپ ہے اور میں خدا کے ساتھ شخصی قریبی رشتہ رکھتا ہوں۔ ان دو امور کو ہمیں یکساں ماننا پڑتا ہے اور ان کے ماننے سے یہ ہم پر منکشف ہو جاتا ہے کہ ایک خدا میں ایک سے زیادہ اقانیم ہیں۔ اب جو بیان ہو چکا ہے اُس کی روشنی میں ہم

دریافت کریں کہ یہ نتیجہ کس پر منحصر ہے مسئلہ کے خلاف جو اعتراضات کئے جاتے ہیں وہ اس لحاظ سے ہیں کہ اس مسئلہ کو ایک عقلی مسئلہ قرار دیتے ہیں اور قیاسی بات سمجھتے ہیں ۔ حالانکہ یہ مسئلہ ان دو امور کے ماننے پر مبنی ہے اور یہ دونوں امور تواریخی تجربہ سے پیدا ہوتے ہیں جن کی تشریح انسانی کانشنس کے ذریعہ ہوتی ہے اور اب تک اس کی تائید بھی انسانی تجربہ اور کانشنس کرتا ہے ۔ چونکہ ہم امور واقعی کو قیاس پر ترجیح دیتے ہیں اس لیے مسئلہ ثالوث کے ماننے پر مجبور ہوتے ہیں اگر ہم محض منطقی نتائج پر بھروسہ کرتے تو ہم باوجود ان اعلےٰ نتائج کے ہم ان سے رضامندی ظاہر کرنے پر مجبور نہ تھے ۔ لیکن چونکہ ہم عقل کی نسبت کانشنس کو بہتر اور افضل ہادی مانتے ہیں اور ہم ایسے اہم امور میں دلائل عقلی پر اپنا تکیہ نہیں کرسکتے اس لئے ہم اس حس اخلاقی کے تقاضا کو قبول کرلیتے ہیں اگرچہ اس کا سمجھنا بھی ہماری عقل کی رسائی سے پرے ہو ۔ ان عملی سادہ اخلاقی وجوہات کے باعث ہم کثرت اقانیم کو خدائے واحد میں مان لیتے ہیں ٭

اس لئے یہ اعتراض کہ مسئلہ ثالوث محض عقلی مسئلہ ہے نہایت ہی غیر معقول ہے ۔ اِس کے خلاف دلیل لاکر چاہے اس کو رد کرو ۔ یہ مسئلہ نہایت اہم اور ضروری ہے ۔ جب تک زبردست دلائل سے اس کی تائید نہ ہو ایسے قبول نہیں کرسکتے اور جو اعتراض دیانتداری سے اس کے خلاف کیا جائے اُس کا تسلی بخش جواب ملنا چاہیئے ۔ لیکن یاد رہے کہ ہم جو اس مسئلہ کو مانتے ہیں کانشنس کے قائل ہونے پر مانتے ہیں جو دعوے مسیح نے کئے اُن کو کانشنس پورے طور سے تسلیم کرلیتا ہے

اس بنا پر ہم مسیح کو خدا کہتے ہیں ۔ اس لئے نہ عقل کے قائل ہونے سے بلکہ کانشنس کے قائل ہونے پر ہم باپ اور بیٹے کا اقرار بپتسمہ کے وقت کرتے ہیں ۔ اگر کلیسیا کے اس عقیدہ کو برطرف کریں کہ اناجیل کا مسیح مزامیر کا خدا ہے ۔ یعنی جس مسیح کا اناجیل میں ذکر آیا ہے حقیقت میں وہی ہے جو مزامیر میں خدا کہلاتا ہے ۔ تب مسئلہ ثالوث عقلی قیاسی مسئلہ رہ جاتا ہے پس معترض کو کانشنس کے اس یقین کا لحاظ کرنا ضرور ہے ۔ اس لئے مسئلہ ثالوث کسی فلسفہ کے مکتب میں پیدا نہیں ہوا بلکہ مسیحی کلیسیا میں ۔ البتہ اس کا ذکر کرنا ضرور نہیں کہ فلسفی خیالات نے اس عقیدہ کی موجودہ صورت بنانے میں کیا مدد کی ۔ تواریخی طور پر یہ بات ثابت ہے کہ جب تک یہ مسئلہ فیلسوفوں کے ہاتھ میں رہا یہ محض قیاس ہی تھا ۔ لیکن اس سے برسوں پیشتر کہ مسیحی دین فلسفہ سمجھا گیا ۔ پیشتر اس سے کہ اسکندری خیالات نے اس میں دخل پایا ۔ اتھاناسیس سے اور اوریگن سے کلیمنٹ اسکندری سے پیشتر قدیم مسیحی شہیدوں پہلے معذرت نویسوں میں ثالوث کی تعلیم زندہ اور موثر عقیدہ تھا ۔ یوں اس عقیدہ کا سراغ مسیحیوں کی تمیز تک جا پہنچتا ہے نہ افراد کے لحاظ سے بلکہ جماعت کے لحاظ سے ٭

اگر صورت حال یہ نہ ہوتی تو سنڈکی آئت اور باقی مذکورہ رسولی تعلیم کا کیا مطلب سمجھ میں آتا مخفی نہ رہے کہ جنہوں نے یہ الفاظ اور محاورے استعمال کئے وہ عبرانیوں کے عبرانی تھے جن کو مدت دراز کی تربیت نے یہ سکھا دیا تھا کہ خدا کا نام لینا بھی کیسا ہولناک ہے اور اُس کے ساتھ کسی انسان یا دیگر مخلوق کو شریک کرنا کیسا کفر ہے ۔ نہ فیلسوف بلکہ سرگرم یہودی اپنے معمولی دعا و سلام میں خدا کے ساتھ جو سب کا باپ ہے یسوع مسیح اس کے بیٹے

اور رُوح القدس کا نام ملا دیتے ہیں اور تینوں سے برابر برکتیں اور انعام طلب کرتے ہیں اور یوں کہتے ہیں "ہمارا ایک خدا ہے جو باپ ہے جس سے ساری چیزیں ہیں اور ہم اس میں ہیں۔ اور ایک خداوند یسُوع مسیح ہے جس کے ذریعہ ساری چیزیں ہیں اور ہم اس کے ذریعہ ہیں۔" یہودی خیالات میں ایسے عجیب انقلاب کا سبب مسیح کی زندگی کے واقعات کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا اور جب ہم ان واقعات پر غور کریں گے تو یہ سارا بیان بالکل سمجھ میں آ جائیگا۔ ان لوگوں کے جب کانشنس قائل ہو گئے کہ مسیح خدا ہے تو اس سے الٰہی ذات کا ایک نیا پہلو منکشف ہو گیا۔ یہ تو ان کی عقلوں اور دلوں ہر اصول کے خلاف تھا کہ کسی انسان کو خواہ وہ کیسا ہی مقدس ہو خدا کی ذات میں شامل مان لیں اور جب ان کو مسیح کی الوہیت تسلیم کرنی پڑی تو انہیں یہ تسلیم بھی کرنا پڑا کہ الٰہی ذات میں ایسے شخصی رشتے ہیں جن کو محض قیاس یا غور و فکر سے خیال میں نہیں لا سکتے۔

علاوہ ازیں یہ رشتہ جو تواریخی واقعہ کے طور پر منکشف ہوا ہے کہ باپ اور بیٹے میں موجود ہے وہ نہ صرف کانشنس کے قائل ہونے پر مبنی ہے بلکہ مسیحی زندگی پر اس کا بڑا گہرا اثر ہوتا ہے۔ خود مسیح کی زندگی میں چونکہ اس کی جڑ ہے اس لئے اس کی یہ تاثیر ہوتی ہے۔ مسیح کی زندگی کا خاصہ خواہ کسی انجیل کو پڑھیں یہ ہے کہ اس نے اپنے تئیں باپ کی مرضی کے سپرد کر دیا اور اسی مرضی کو پورا کرنا اس کی زندگی کا مقصد تھا۔ جو دعا اس نے خود سکھائی اس میں اس کی زندگی کا یہ خاصہ جو اول سے آخر تک نمودار ہے یوں بیان ہوا ہے "اے ہمارے باپ تو جو آسمان میں ہے تیرا نام پاک مانا جائے تیری بادشاہی آئے تیری مرضی ...... پوری ہو" کام کے

شروع میں جو تہری آزمائش اس کو پیش آئی خدا کی مرضی اور اس کے کلام کی اطاعت کے ذریعہ اس پر فتح حاصل کی اور گتسمنی کے باغ میں سخت آزمائش پر غلبہ انہیں الفاظ کے ذریعہ ہوا کہ "میری مرضی نہیں بلکہ تیری مرضی پوری ہو" اس کا یہ مزاج جو تین پہلی اناجیل سے ظاہر ہوتا ہے اس کی گویا تشریح یوحنا کی انجیل میں ہے۔ مقدس متی کی انجیل میں وہ یہ کہتا ہے "اے باپ آسمان و زمین کے مالک میں تیری حمد کرتا ہوں کہ تو نے یہ باتیں داناؤں اور عقلمندوں سے چھپائیں اور بچوں پر کھول دیں۔ ہاں اے باپ کیونکہ ایسا ہی تجھے پسند آیا میرے باپ کی طرف سے سب کچھ مجھے سونپا گیا اور کوئی بیٹے کو نہیں جانتا سوائے بیٹے کے اور اس کے جس پر بیٹا ظاہر کرنا چاہے" مقدس یوحنا کی انجیل میں وہ یہ کہتا ہے "میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ بیٹا آپ سے کچھ نہیں کر سکتا سوا اس کے جو باپ کو کرتے دیکھتا ہے اور جن کاموں کو وہ کرتا ہے انہیں بیٹا بھی اسی طرح کرتا ہے۔" پھر اس نے کہا "جس نے مجھے دیکھا ہے اس نے باپ کو دیکھا ہے تو کیونکر کہتا ہے کہ باپ کو ہمیں دکھلا کیا تو یقین نہیں کرتا کہ میں باپ میں ہوں اور باپ مجھ میں ہے یہ باتیں جو میں تمہیں کہتا ہوں اپنی طرف سے نہیں کہتا لیکن باپ مجھ میں رہ کر اپنے کام کرتا ہے۔"

ان آیات کی تشریح کرنا اس مقام میں طوالت ہوگا لیکن اس قدر کہنا تو ہمارے مقصد کے لئے کافی ہوگا کہ ان آیات میں باپ اور بیٹے کا ایسا رشتہ منکشف ہوتا ہے جو اخلاقی یا روحانی طور پر بہت ہی گہرا ہے اور انسان کے دل پر بہت بڑا اثر کرتا ہے۔ انسان کے دوسرے تجربوں کی بنا پر ہم سوچیں کہ ان سے کیا مراد ہے۔ الفاظ کے پردہ میں کچھ حقیقت چھپی

ہوتی ہے ویسا ہی یہ الفاظ باپ اور بیٹا دو حقیقتوں پر دلالت کرتے ہیں۔ لفظ خدا سے ایک ایسی حقیقت یہودیوں کے نزدیک مراد تھی کہ اگر کوئی اُسے اپنا باپ یا اُس کا بیٹا کہتا تو بڑی گستاخی اور کفر کی بات ہوتی۔ لفظ باپ اور بیٹے میں جو گہرا قریب رشتہ پایا جاتا ہے ویسا کسی انسان یا مخلوق کا خدا سے نہیں ہو سکتا البتہ اگر کسی قوم یا فرقہ میں خدا کا تصور ادنیٰ ہو گیا ہو جیسا یونانیوں یا غیر اقوام میں ہو گیا تھا تو ان کے لئے خدا اور انسان کے درمیان ایسا رشتہ مان لینا کچھ مشکل نہ ہوگا۔ اور ساتھ ہی ایسے اتحاد کا تصور بھی ادنیٰ ہو جائیگا۔ لیکن جب خدا کا تصور اعلےٰ ہوتا ہے جیسے کہ یہودیوں میں تب خدا کی مرضی اور انسان کی مرضی کے درمیان ایسا کامل اتحاد تقریباً ناممکن اور بیرون از قیاس ہو جاتا ہے۔ فوق الفطرت مکاشفہ کا تصور ہو سکتا ہے۔ لیکن جن الفاظ میں ہمارا خداوند بیان کرتا ہے کہ خدا کی مرضی اور ابن آدم کی مرضی میں ایسا کامل اور مستقل اتحاد ہے انسان کے خیال میں نہیں آ سکتا ان الفاظ کو ہم محض استعارۃً بھی نہیں کہہ سکتے۔ وہ ایسی سنجیدگی سادگی اور زور سے بیان ہوئے ہیں کہ ان کے صاف صریح معنے پورے طور سے لینے پر ہم مجبور ہوتے ہیں +

اب ذرا غور کریں کہ ان الفاظ کی تاثیر مسیحیوں کے دلوں پر کیا ہوئی مسیحی بزرگوں نے خدا کی مرضی کی اطاعت صرف اسی لحاظ سے نہیں کی کہ وہ ایک اعلےٰ طاقت ہے بلکہ ان کے دل میں ایک گہرا اعلےٰ دلی یقین پیدا ہو گیا۔ کہ وہ مرضی ہمارے انسانی لازمی جذبات کے عین مطابق ہے اسلئے نہ صرف اس کی اطاعت فرض ہے بلکہ اُسے پیار کرنا چاہئے اور اپنی مرضی ایسے طور پر اس کے ساتھ ملانی چاہئے جیسے کسی گہرے دوست کی مرضی سے۔ اس دلی یقین نے مسیحی قوموں کی کل زندگی پر بڑی تاثیر کی کہ وہ نڈر صابر بن گئے توہمات

سے آزاد ہو گئے۔ فطرت پر زیادہ غور کرنے لگے۔ سائنس اور اخلاق میں ایسی بڑی ترقی کر گئے۔ ایک دن تو تاریخ اس کی پوری کیفیت کو ظاہر کرے گی۔ بہر حال یہ شریف اخلاقی خیال ہے۔ لیکن اس کی بنیاد کیا ہے؟ یہ اسی انجیلی رسولی یقین پر مبنی ہے کہ ہم اُس کے ساتھ شراکت کا دعویٰ رکھ سکتے ہیں جو ابن خدا ہونے کی حیثیت سے خدا کی مرضی میں پوری رسائی رکھتا اُس کو پیار کرتا اور اس کے ساتھ یگانگت رکھتا نہ محض مخلوق کے طور پر بلکہ فرزندانہ طور پر یعنی جیسے بیٹے کی معقول و اخلاقی اطاعت کہہ سکتے ہیں۔ اسی تیقن کے باعث رسول کہتا ہے "تم نے غلامی کی روح نہیں پائی کہ پھر ڈرو بلکہ لےپالک ہونے کی رُوح پائی جس سے ہم ابّا یعنی اے باپ پکار پکار کہتے ہیں۔ وہی رُوح ہماری روح کے ساتھ گواہی دیتی کہ ہم خدا کے فرزند ہیں اور جب فرزند ہوئے تو وارث بھی یعنی خدا کے وارث اور میراث میں مسیح کے شریک" جہاں تک ہم مسیح کے ساتھ اُس کی روح کے ذریعہ رشتہ رکھتے ہیں وہاں تک ہم بھی اُس کے لےپالک بیٹے ہونے کا حق رکھتے ہیں لیکن جو اصلی اتحاد مسیح کی مرضی اور خدا کی مرضی کے درمیان تھا وہ اِس امر پر بھی دال ہے کہ ان کی ذات ایک ہی ہے یوں یہ مسئلہ کہ باپ اور بیٹے کی ماہیت ایک ہی ہے فلسفی رائے کی نسبت زیادہ پُر تاثیر ہے +

اگر مسئلہ ثالوث کی حقیقت در بارہ ابن خدا کے ان اخلاقی دلائل کے ذریعہ سمجھ میں آ جائے تو ثالوث کے تیسرے اقنوم یعنی روح القدس کے بارہ میں اصولاً کوئی دقت باقی نہیں رہتی مختصر یہ کہنا کافی ہوگا کہ اگرچہ روح القدس کی الوہیت کا مسئلہ مسیح کی شہادت پر مبنی ہے تو بھی تواریخ اور کانشنس اس کی شہادت دیتے ہیں۔ مسیح کی زندگی ہی سے پھر

شروع کریں۔ اُس زندگی نے ایک طرف تو ہم پر خدا باپ کو منکشف کیا جس کے ساتھ ہمارا خداوند فرزندانہ رشتہ رکھتا تھا لیکن دوسری طرف پوری کامل رفاقت۔ ہمارے خداوند نے ایک روح کا بھی ذکر کیا جو باپ سے نکلتی ہے جسے وہ اپنی رحلت کے بعد اپنے شاگردوں کے پاس بھیجیگا جو انہیں ساری سچائی کی راہ میں چلائیگا جو انہیں ساری باتیں سکھائیگا اور وہ ساری باتیں یاد دلائیگا جو اُس نے اُن سے کہی تھیں اور جس کا ان کے ساتھ وہی رشتہ ہوگا جو خود مسیح کا ان سے تھا۔ یہ بھی تواریخی واقعہ ہے ہم کسی عقلی قیاسی دلیل کو پیش نہیں کرتے بلکہ کانشنس کو شاہد لاتے ہیں۔ یہ وعدہ پورا ہوا۔ اناجیل سے ظاہر ہے کہ مسیح کے صعود سے پیشتر رسولوں کی کیا حالت تھی اور خطوں سے ظاہر ہے کہ پھر کیسی حالت ہوگئی۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اُس زمانہ میں چال چلن فلسفہ اور اخلاق کا کیا حال تھا اگر ہم خطوں کی روحانی اور اخلاقی اعلےٰ تعلیم کا مقابلہ اُس تعلیم سے کریں جو اُس سے پیشتر غیر اقوام یا یہود میں پائی جاتی تھی تب ہم فیصلہ کر سکیں گے کہ وعدہ پورا ہوگیا اور ایک نئی ایسی تاثیر کلیسیا پر نازل ہوئی اور اُس میں نئی اخلاقی روحانی زندگی اُس میں پھونک دی جہاں ہم نے راستباز ٹھہرنے کے طریقہ پر بحث کی تھی وہاں ہم نے مفصل بتا دیا تھا کہ اس نئی اخلاقی خلقت کی کیا کیفیت ہے۔ اور یہ بھی ظاہر کیا گیا کہ رُوح القدس کی شخصیت کا مسئلہ رسولوں کے تجربے اور مسیحی زندگی کی ضروریات کے مطابق ہے اِس لیئے یہ کہنا کافی ہے کہ جو شہادت خطوں سے اور مسیحی کلیسیا کے تجربہ سے خدا کی روح کی شخصی تاثیر کے بارہ میں ملتی ہے اُس سے مسیح کے کلمات کی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ روح القدس تیسرے الٰہی اقنوم کو بھیجیگا۔ تاثیر ایک تواریخی

امر ہے جو کانشنس کی شہادت پر مانا جاتا ہے اور اِس کی تشریح مسیح کے کلمات اور اس کے رسولوں کی تحریروں سے ہوتی ہے۔

اِس مسئلہ کی تصدیق انسانی کانشنس کے دیگر تجربوں سے بھی ہوتی ہے جن کی تاثیر کو دیگر مذاہب نے بہت مانا ہے یعنی خدا کی تلاش میں جو لوگ رہے ہیں انہوں نے محسوس کیا کہ مخلوق انسان خالق خدا سے کتنا بعید ہے اور یہ ماننا کیسا مشکل ہے کہ انسان بحیثیت انسان کے خدا کے ساتھ وہ شراکت اُس کی مرضی کے ساتھ وہ اتحاد اُس کی حکمت کے ساتھ وہ مطابقت اور وہ محبت اُس کی ذات سے ہوسکتی ہے جس کی آرزو انسان کی روح کو ہے روح القدس کا مکاشفہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ جیسے خدا نے اپنے فضل اور سچائی کو اپنے بیٹے میں منکشف کیا اور اس کے وسیلہ ہم کو اپنے ساتھ ملایا ویسا ہی وہ ہم کو تنہا نہیں چھوڑتا کہ اُس کے پاس جائیں بلکہ وہ خود روح القدس کے ذریعہ اپنا ہاتھ ہمارے دلوں پر رکھتا ہے ہم کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور اپنی مرضی اور حکمت کے سانچے میں ہم کو ڈھالتا ہے "اسی طرح روح بھی ہماری کمزوریوں میں ہماری مدد کرتی ہے کیونکہ جیسا چاہیئے ہم نہیں جانتے کہ کیا دعا مانگیں پر وہ روح ایسی آہیں بھر کے جن کا بیان نہیں ہوسکتا ہماری سفارش کرتی ہے" الغرض خواہ اخلاقی طور پر یا فلسفہ کے طور پر اسے سوچیں خدا کی شراکت و رفاقت کے لائق خدا ہی ہوسکتا ہے اور ہماری رفاقت باپ کے ساتھ صرف اُسی صورت میں ہوسکتی کہ خدا ہمارے اندر بسے اور ہم کو خدا کے ساتھ ملائے ہم خدا روح کے ذریعہ خدا بیٹے کے ساتھ وارث ہیں اور یوں خدا کے ساتھ ہماری شراکت ہوسکتی ہے۔

اب مقدس ثالوث سے ہیں دعا مانگتا ہوں کہ اگر اُس کی مرضی کے
خلاف کچھ کہا گیا ہو یا کہنے سے کچھ رہ گیا ہو تو وہ معاف کرے۔ جس امر کو
ثابت کرنے کی کوشش کی تھی وہ یہ تھی کہ مسئلہ ثالوث کی بنا عقل پر
نہیں بلکہ کانشنس پر ہے اور یہ اخلاقی مسئلہ ہے نہ محض عقلی۔ اور یہ بھی
قابل لحاظ ہے کہ جن الفاظ میں یہ مسئلہ کتاب مقدس میں بیان ہوا ہے وہ سب
اخلاقی الفاظ ہیں نہ فلسفی۔ مقدس مصنف یہ نہیں لکھتے توحید فی التثلیث
یا تین اقانیم ایک جوہر میں بلکہ وہ باپ بیٹے اور روح القدس کا ذکر کرتے ہیں کہ
باپ اور بیٹا ایک ہیں اور روح باپ سے نکلتی ہے اور بیٹا اس کو بھیجتا ہے۔
اس لئے ثالوث کے اخلاقی معنے پر زور دینا چاہیئے۔ یہ ہے الٰہی اور انسانی زندگی
کی تشریح ہے اور ہم دل وجان سے اقرار کرتے ہیں کہ "باپ خدا ہے بیٹا خدا
ہے اور روح القدس خدا ہے تو بھی تین خدا نہیں بلکہ ایک خدا ہے"۔

آٹھواں لکچر

خلقت کا درد

"خلقت کمال آرزو سے خدا کے فرزندوں کے ظاہر ہونے کی راہ تکتی ہے"

(رومیوں ۸: ۱۹)

لکچروں کے اس سلسلہ میں جو باتیں بیان ہوئی ہیں ان سے یہ نتیجہ نکلا جو
اُس اصول کے مطابق ہے جس سے ہم نے شروع کیا تھا وہ اصول یہ

ہے حق اور ناحق کی حس۔ جتنے ہمارا مباحثہ مسیحی دین کے بارہ میں ہے وہ اس
حس کی فوقیت اور عظمت مان چکے ہیں۔ ان لکچروں میں بار بار یہ سوال آیا کہ اُس
حس یعنی کانشنس سے مراد کیا ہے اور ہم نے اس بات کو ظاہر کرنے کی کوشش
کی کہ اس کا تقاضا صرف انجیل کی تعلیم سے پورا ہوتا ہے۔ اس تحقیقات کا نتیجہ (جہاں تک
کہ اس دلیل پر تکیہ کر سکتے ہیں) یہ نکلا کہ اُس حس کی فوقیت اور عظمت کے ہم زیادہ قائل
ہو گئے اور ہم پر یہ ظاہر ہو گیا کہ ہماری ساری زندگی اخلاقی اور شخصی رشتوں پر دلالت
کرتی ہے نہ صرف اس جہان کی زندگی بلکہ اُس جہان کی زندگی بھی۔ نہ صرف طبعی جہان
میں بلکہ روحانی جہان میں بھی۔ زمانہ حال میں سائنس کا زور بھی اس نتیجہ کی طرف ہے
خواہ ان کی خاص رائیں درست ہوں یا غلط وہ اس امر کی تو شہادت دیتی ہیں کہ
کس طرح سے کل فطرت نے انسان کے نشوونما و ترقی میں اور اخلاق کے نشوونما و ترقی
میں مدد کی ہے۔ جہاں تک ہمارا مشاہدہ گزرتا ہے جس عجیب کل کی ہم جز میں اُس کا
اعلےٰ کمال کانشنس میں نظر آتا ہے۔ انسانی تہذیب ایک وسیع پیچیدہ منظر ہے۔
لیکن جیسے حرکت کے تین قوانین اور اقلیدس کے چند علوم متعارفے کل عالم کی
حرکات کی تشریح کے لئے کافی ہیں ویسے اخلاق کے چند قوانین نوع انسان
کی تربیت اور ترقی پر محیط ہیں۔ علاوہ ازیں انسانی تہذیب فطرت کا ایک نمایاں
جز ہوتی جاتی ہے۔ چونکہ انسان فطرت کا خادم اور تشریح کنندہ ہے اس لئے
وہ فطرت کا حاکم بھی ہے۔ فطرت کے خزانوں کو وہ ترقی دیتا اس کے حاصلات
کو تبدیل کرتا اور فطرت کی صورت کو بدل ڈالتا ہے۔ جب کوئی فرقہ یا قوم چند اخلاقی
قوانین پر عمل کرتی ہے تو اس کی تاثیر نہ صرف عالم حیوانی پر ہوتی ہے بلکہ عالم نباتی
پر بھی۔ الغرض انسان فطرت کا حاکم ہے اور کانشنس انسان کا حاکم ہے۔ پس جو
اعلےٰ طاقت اس دولتمند سلطنت میں کام کر رہی ہے جس کے آگے روئے زمین

کے بڑے بڑے بادشاہ سرخم کرتے ہیں وہ اخلاقی قوت ہے جس کے ذریعہ باہمی مناسب رشتے قائم رہتے ہیں جو ہمارے چاروں طرف موجود ہیں۔ طبعی جہان میں بھی سب سے زبردست طاقتیں وہ ہیں (جیسا کہ ہمیں روزبروز معلوم ہوتا جاتا ہے) جو ان آنکھوں کے مشاہدہ میں چنداں نہیں آتیں۔ سمندر کے جوش و خروش اور ہوا کے آندھی و طوفان باریک ذرات یا اور لطیف برقی کشش پر مبنی ہیں۔ ویسا ہی زمانہ حال کی کلون کی یہ طبعی طاقت نہیں بلکہ کانشنس کی دھیمی آواز جس کے ساتھ کلون کے موجد مرئیب ہوتے ہیں ساری کاول بدلی اور عقلی قوتوں پر حکمران ہے۔

ان بیانات کا زور اور بھی زیادہ معلوم ہوگا جب ہم کانشنس کو ایک ایسی قابلیت سمجھ لیں گے جس کے ذریعہ ہمارا واسطہ ایک ایسے راستباز ذی عقل وجود سے ہو جاتا ہے جو ساری دیدہ و نادیدہ چیزوں کا خالق اور حافظ ہے محض یہی بات نہیں کہ کانشنس کے ذریعہ ہم پر ایک ایسا راستباز خدا منکشف ہو جاتا ہے جس کے ساتھ ہمیں معاملہ پڑتا ہے۔ بلکہ ایسا خدا ہم پر منکشف ہوتا ہے جس کی راستبازی اور معقولیت یا مقدس یوحنا کے مطابق جس کا لوگاس خلقت کا قانون ہے۔ راستباز خدا باعث اپنی راستبازی کے ضرور قادر مطلق ہوگا۔ کیونکہ جو حق اپنی قدرت نہیں دکھا سکتا وہ ایک ہنسی کی بات ہوگی۔ اس لئے مکاشفہ کا یہ جملہ منور شدہ کانشنس کا کلام ہے کہ ابتدا میں لوگاس تھا لوگاس خدا کے ساتھ تھا اور لوگاس خدا تھا" اور کہ "سب چیزیں اس سے موجود ہوئیں اور کوئی چیز موجود نہ تھی جو بغیر اس کے ہوئی"۔

مگر اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جہاں تک انسان بذریعہ اپنے کانشنس کے راستباز ذی عقل اور متشخص خدا کے ساتھ اتحاد و اتفاق رکھتا ہے جو آسمان و زمین

کا خالق ہے اسی قدر انسان کل فطرت اور اسباب موجودات سے اتحاد و اتفاق رکھتا ہے۔ کانشنس کی آواز کے حقیقی معنے متشخص خدا کو ہمیشہ تسلیم کرنا اس کی راستبازی کو قبول کرنا اور سب سے بڑھ کر اس وجود پر ایمان لانا جو مجسم کانشنس اور عقل ہے اور ابن خدا ہونے کا دعویٰ کرتا ہے یہ اخلاقی افعال دینی زندگی میں محض حوادث نہیں۔ محض روحانی زندگی کی شرائط ہیں بلکہ انہیں کے ذریعہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمارا جہان کے ساتھ خواہ وہ طبعی ہو یا اخلاقی و روحانی کیساں حقیقی رشتہ ہے۔ چنانچہ پولس کو جو مکاشفہ مسیح کے بارہ میں ملا وہ محض یہی نہ تھا کہ مسیح جہان کا منجات دہندہ ہے بلکہ کل خلقت کے اخلاقی مرکز کا مکاشفہ بھی تھا۔ اس اخلاقی تصور کو رسول کے الفاظ سے ویسے ہی نکال سکتے ہیں جیسے یوحنا کے الفاظ سے نکالی تھی۔ چنانچہ پولس الہی مرضی کے بھید کو یوں بیان کرتا ہے "وقتوں کے پورے ہونے کے انتظام پر سب چیزوں کے سر سے خواہ وہ جو آسمانوں پر خواہ وہ جو زمین پر ہیں مسیح میں ملا دے جس میں ہم نے بھی اس کے ارادہ کے موافق ...... میراث پائی" مثلاً جب رسول نے باپ کا شکر ادا کیا تو اس نے کل روحانی، اخلاقی اور طبعی عالم کو ملا دیا "اسی نے ہم کو تاریکی کے قبضہ سے چھڑایا اور اپنے پیارے بیٹے کی بادشاہت میں داخل کرایا۔ اس میں ہم اس کے لہو کے سبب سے مخلصی یعنی گناہوں کی معافی پاتے ہیں وہ اندیکھے خدا کی صورت ہے اور وہ ساری خلقت کا پہلوٹھا ہے۔ کیونکہ اسی سے ساری چیزیں جو آسمان اور زمین پر ہیں دیکھی اور اندیکھی کیا تخت کیا حکومتیں کیا ریاستیں کیا مختاریاں پیدا کی گئیں ساری چیزیں اسی سے اور اس کے لئے پیدا ہوئیں اور وہ سب سے آگے ہے اور اسی سے ساری چیزیں بحال رہتی ہیں"۔ ایسے بیانات محض

خیالی فلسفہ کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ اس گہرے اخلاقی یقین کا اظہار ہیں کہ راستبازی عالم کا قانون ہے اور مسیح راستبازی کا خداوند ہونے کی حیثیت سے سب کا خداوند ہے۔ اِن بیانات کا مقصد و منشا کانشنس ہیں منعکس ہوتا ہے حق و ناحق کی پہچان ہیں اور مشخص خدا کے ساتھ رشتہ رکھنے ہیں نمودار ہے۔ اور لازمی فرض کا خیال اسی امر پر مبنی ہے کہ ایک طرف تو ہمارا رشتہ خدا کے ساتھ ہے اور دوسری طرف فطرت کے ساتھ۔ جو لوگ کانشنس کی ہدایت پر نہیں چلتے وہ اُن سیاروں کی طرح ہیں جو اپنے آفتاب سے الگ ہو جاتے ہیں اور اپنے سارے نظام میں خلل ڈال دیتے ہیں +

اب ذرا اس اخلاقی مکاشفہ کی روشنی میں اُس مسئلہ رنج و دکھ پر غور کریں جو فطرت میں ہم کو اٹھانا پڑتا ہے اور جس کے حل کرنے میں نادان و دانا دونوں حیران ہیں۔ سٹوارٹ مِل صاحب نے اپنے بعض رسالوں میں اس مسئلہ کا بہت ذکر کیا ہے لیکن یہ مسئلہ بہت قدیم ہے۔ ایوب کی کتاب میں اسی کا ذکر ہے اسی پر غور کرنے سے کئی فلسفہ پیدا ہو گئے اور مذہبوں کی بنا پڑ گئی۔ مِل صاحب کہتے ہیں کہ جسکو لوگ ابتری کہتے ہیں وہ فطرت کا گویا دوسرا پلڑا ہے۔ ابتری اور خوف و دہشت جو بے انصافی بربادی اور لوٹ کو پیدا کرتے ہیں وہ اُسی قسم کے ہیں جیسے آندھی طوفان اور مری آندھی اور طوفان وہ مری کے ذریعہ کوئی ابتری فطرت میں پیدا نہیں ہوئی ویسے ہی بے انصافی وغیرہ بھی اسباب موجودات میں ابتری کا نتیجہ یا باعث نہیں +

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ساری خلقت پر ایک طرح کی لعنت چھا رہی ہے اور نہ صرف انسان بلکہ کل فطرت دکھ اور موت کے بوجھ تلے

پڑی کراہ رہی ہے۔ جو مکاشفہ اس بھید کا سامنا نہیں کر سکتا اور اس کو خدا کی راستبازی کے مطابق ثابت نہیں کر سکتا وہ مسیحی دعویٰ سے کہیں ادنیٰ ہے لیکن بائبل شروع میں بھی اور آخر میں بھی اس مسئلہ کا ذکر کرتی ہے گو اس مسئلہ کو کھول کر صاف طور سے بیان تو نہیں کر دیتی لیکن وہ بتاتی ہے کہ اس کا تعلق ہماری روحوں اور عین اخلاق کے ساتھ ہے +

جو کچھ میں نے کانشنس کی عظمت کے بارہ میں کہا تھا کہ اس کی حکومت محض بلحاظ فرداً قابلیتوں کے افراد پر نہیں بلکہ عالم کا خاص بڑا قانون یہ ہے۔ اب میں اُس کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ یاد رکھئے کہ انسان فطرت کا اصلی جز ہے اور کانشنس انسان کا نہایت ضروری جز ہے۔ پس اگر انسان اپنے کانشنس کی حکم عدولی کرے تو اس کا کیا نتیجہ ہوگا۔ ایسی حکم عدولی بربادی ہوگی اس کے ذریعہ خدا اور جہان میں جدائی ہو گی۔ خالق اور مخلوق کے درمیان جو اتحاد تھا اُس میں فرق آ جائیگا کیونکہ اس کے ذریعہ خدا میں اور ذیعقل اخلاقی مخلوقات میں جدائی ہو گی حالانکہ خدا نے چاہا تھا کہ اس مخلوق کے ذریعہ اپنی اخلاقی حکومت ساری مخلوقات پر ظاہر کرے۔ اس لحاظ سے ہم بکمال سنجیدگی یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب پہلے نافرمانی ہوئی اور جو خدا کا پیمان تھا اُس میں فرق آیا تو گویا آسمان گر پڑے۔ اس مسئلہ کو خواہ کیسا ہی سمجھو اور بیان کرو اس سے کانشنس اور اخلاق کی عظمت و فوقیت تو بخوبی عیاں ہے۔ اس کے ذریعہ سے گویا یہ اعلان دیا جاتا ہے کہ اخلاقی جہان طبعی جہان پر فوق رکھتا ہے اور اگر اخلاقی جہان میں کچھ فرق آ جائے تو اُس سے طبعی جہان میں بھی خلل آ جائیگا +

سٹوارٹ مِل اور دیگر عالم جب جہان کی اس ناہمواری اور ابتری کا ذکر کرتے ہیں تو وہ اس امر کو اکثر بھول جاتے ہیں۔ وہ لوگ فطرت کو آدمی سے

علیحدہ خیال کرتے ہیں اور ان کے نزدیک انسان کی اخلاقی حالت کا فطرت کے ساتھ کچھ تعلق نہیں۔ ان کی غلطی دراصل یہ ہے کہ وہ جہان کی اس ظاہرا ترتیب کو بھی اس کی حقیقی ترتیب سمجھتے ہیں اور ان کے خیال میں یہ نہیں آتا کہ اخلاقی اسباب کے یا انسان کی مرضی کے ذریعہ اس ظاہری ترتیب میں کچھ نقص آسکتا ہے۔ ایسے اعتراضوں کا جواب دینے کے لئے اور مقدس نوشتوں کی تعلیم سمجھنے کے لئے ہم ایک اور بات پر غور کریں جس کو آجکل کے عالم نظر انداز کرتے ہیں۔ یعنی ہم اخلاق کو نہ صرف فطرت کا جز بلکہ اُس کا سرتاج سمجھیں بائیبل میں جس لحاظ سے زندگی پر نظر ڈالی گئی ہے وہ اور ہے سائنس جس لحاظ سے اس پر نظر ڈالتی ہے وہ اور ہے۔ سائنس کا خیال تو یہ ہے کہ ہم طبعی جہان میں رہتے ہیں اور اخلاقی جہان ان کا جز ہے۔ عبرانی اور مسیحی خیال یہ ہے کہ ہم اخلاقی عالم میں رہتے ہیں اور طبعی جہان اُس کا جُز ہے۔

میں نے پہلے ایک موقعہ پر کانٹ (Kant) صاحب کے ایک مقولہ کا ذکر کیا تھا۔ جس میں اُس نے کہا کہ دو اُمور نے اُسے حیران اور متعجب کر رکھا ہے۔ ایک تو تاروں بھرا آسمان جو میرے اوپر ہے۔ دوم قانونِ کانشنس جو میرے اندر ہے لیکن یہودی اور مسیحی رسول پولوس جیسے کے لئے یہ اندرونی کانشنس اوپر کے ستاروں بھرے آسمانوں کی جگہ تھا۔ اُس کی اخلاقی اور روحانی آنکھ کے سامنے ایک ایسا آسمان ہمیشہ موجود تھا جو وسعت اور تاثیر میں اس گنبدِ گردوں سے کہیں بڑھکر تھا۔ اس گنبد گردوں کے جھروکے میں سے اُس نے دیکھا کہ آسمان و زمین کا خداوند اُسے محیط ہے وہ خداوند جو اپنی ساری راہوں میں راستباز ہے اور اپنے سارے

کاموں میں مُقدس ہے اور اُس کی راستبازی اور پاکیزگی نے اپنی تاثیر کے ذریعہ اعلےٰ و زبردست قوائے فطرت کو بھی ماند کر دیا جیسے لکھا ہے کہ "زمین اُس کے سامنے کانپتی ہے" نہ محض اُس کی قدرت کے آگے بلکہ اُس کی راستبازی کے آگے۔ "اگر وہ پہاڑوں کو چھوئے" یعنی اپنے راستباز عصا سے چھوئے "تو اُن سے دھواں نکلے گا"۔ انبیا اور رسول ایسے جہان میں رہتے تھے جس میں نہ سورج کی ضرورت تھی نہ چاند کی کہ اُسے روشن کرے۔ کیونکہ وہ خدا کے جلال سے منوّر ہے اور اُس کی راستبازی اُس کا نور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مُقدس نوشتوں میں ذکر ہے۔ طبعی جہان پر اخلاقی بدی کا اثر پڑتا ہے۔ اس لئے یہ بھید بیرونی جہان سے آدمی کی روح کی طرف مستقل ہو جاتا ہے اور وہ دُہرا مسئلہ اکہرا ہو جاتا ہے۔ بعض فیلسوف کے نزدیک بشرطیکہ وہ دہریہ نہ ہو دو الگ مسئلے ہیں ایک تو بیرونی طبعی نقص اور ایک اندرونی اخلاقی بدی لیکن پولوس کے نزدیک چونکہ وہ مسیح اور اُس کی راستبازی کو سارے عالم کا مرکز گردانتا ہے یہ ایک ہی مسئلہ ہے اخلاقی بدی کا۔ یعنی انسانی کانشنس اور ارادہ کا بگاڑ۔ البتہ یہ لاینحل بھید تو اب تک ہے اور یہ کوئی معقول اعتراض اِس تعلیم پر نہیں کہ کیوں اخلاقی بدی کے آغاز کا پورا بیان نہیں کرتی لیکن ہم کم سے کم اتنا تو معلوم کر سکتے ہیں کہ اخلاق بدی کی موجودگی میں طبعی بدی کا عدم ناممکن ہے کیونکہ اسباب موجودات میں اخلاق کو طبعیات پر فوقیت دی گئی ہے۔ جب تک اخلاقی اشخاص کے ارادے جو فطرت کا ایک نہایت اعلےٰ جز ہیں ناقص رہیں گے تب تک فطرت ناقص رہے گی اور اس نقص کا کوئی علاج نہیں سوائے اس کے کہ انسان کے ارادہ

اور خدا کے ارادہ میں موافقت پیدا نہ ہو۔ اس لئے مقدس پولس نے یہ کہا کہ
"خلقت کمال آرزو سے خدا کے فرزندوں کے ظاہر ہونے کی راہ تکتی ہے"
شاید ان الفاظ کے ذریعہ وہ مشکل بھی رفع ہو جائے جو کبھی پیش کی جاتی ہے
کہ انسان کے ظاہر ہونے سے پیشتر بھی دنیا میں دکھ اور موت موجود تھی۔
مخفی نہ رہے کہ مقدس نوشتوں میں انسان کے سوا دیگر اخلاقی اشخاص کا
بھی ذکر آتا ہے جنہوں نے گناہ کیا۔ جیسے ہمارے گناہ کی تاثیر خلقت پر
ہوتی ہے ویسے ان کے بگاڑ اور گناہ کی تاثیر بھی ضرور ہوتی ہوگی اس کی وجہ
خواہ کچھ ہی ہو آیت مذکورہ بالا سے تقریباً یہ مراد ہے کہ خلقت ضرور ناقص
رہے گی۔ کامل ترتیب ہو نہیں سکتی جب تک کہ خدا کے فرزند ظاہر نہ ہوں۔
یعنی جب الٰہی حکمت کی تاثیر مقدسوں کی کلیسیا خدا کے فرزند کی صورت پر بن کر
ساری دنیا میں ظاہر ہو جائے گی تب ان ایمانداروں اور راستبازوں
کی تاثیر سے آسمان و زمین میں اتحاد قائم ہوگا +

اس بڑے مسئلہ کا ذکر انہیں اصولوں کے مطابق انجیل میں ہوا ہے
اور اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اشیا کے اخلاقی پہلو کے یہ غیر مطابق نہیں۔
ان کی مشکل اس سے نہیں کہ وہ اخلاق پر بہت کم زور دیتے ہیں بلکہ یہ کہ
اخلاق پر اتنا زیادہ زور دیتے ہیں۔ اب ہم سوچیں کہ انجیل نے ان اصولوں
کی کیا تشریح کی ہے اور کس طرح اظہور واقعی سے ان کی تصدیق کی ہے۔ اب
فوراً یہ معلوم کر لیں گے کہ جن معجزوں کا انجیل میں ذکر ہوا ہے وہ اس بیان
کے مطابق ہے جو میں نے طبعی اور اخلاقی طبقوں کے درمیان رشتہ ہونے
کے بارہ میں بتایا تھا۔ صرف ایک ہی مثال اس بات کی پیش کی گئی ہے جس
میں طبعی بدی پر کامل اختیار دکھایا گیا ہے اور وہ ایسے شخص کی مثال ہے

جس کا ارادہ کلیتہً راستباز تھا اور وہ یہ کہہ سکتا تھا "میں اور میرا باپ ایک ہیں"۔ جس
لحظہ ایک کامل مقدس شخص ظاہر ہوا تب انسانیت کی قدرتوں پر کامل اقتدار ظاہر ہوا +
کبھی کبھی معجزوں کو فوق الفطرت رسالت کی شہادت میں پیش کیا ہے لیکن ان
کی قدر اس لحاظ سے بھی بڑھ جائیگی کہ وہ اس اخلاقی امر کی لاثانی شہادت ہیں
کہ سب سے اعلےٰ قدرت زمین پر حق سے علیحدہ ہو کر ظاہر نہیں ہوئی اور بدی
کی ساری قوتوں پر غیر محدود اختیار بھی اس کو ملا ہے جو کامل قدوس ہے۔ لاکلام
معجزے قدرت کے مکاشفے ہیں لیکن وہ قدرت راستباز ارادہ کی قدرت ہے۔
اس دلیل کا زور اس بات پر غور کرنے سے اور بھی بڑھ جاتا ہے کہ اس قدرت
کا اظہار نہ محض نجات دہندہ کے راستباز ارادہ پر منحصر تھا بلکہ ان لوگوں کی
راستباز حالت پر بھی جن کے واسطے وہ معجزہ کیا جاتا تھا اور جیسا میں نے ایک گذشتہ
لکچر میں بیان کیا کہ ایمان ایک اخلاقی فعل ہے جس کے ذریعہ آدمی کا کانشنس مسیح
کی دعادی کو تسلیم کر لیتا ہے کہ وہ انسان کی روح کا خداوند ہے اور اس لئے
فطرت کا خداوند بھی ہے جب مرد و عورتوں کا ایمان کے ذریعہ یہ حقیقی رشتہ مسیح
سے ہو جاتا تھا اور اس کے ذریعہ خدا کے ساتھ حقیقی رشتہ ہو جاتا تھا تب خدا
کا راستباز ارادہ بلا رکاوٹ ان پر یا ان کے لئے اثر کر سکتا تھا اور جس حقیقی حالت
میں اخلاقی بدی اور روحانی بے ایمانی کے ذریعہ خلل آگیا تھا وہ بحال ہو سکتی تھی
اس قسم کی تاثیر کے ذریعہ مسیحی دین کا غلبہ ان علموں کی دائمی ترقی کی قدرت
کے ساتھ ملحق ہے جو انسان کی بہبودی کو مدنظر رکھتے ہیں۔ اور انہیں صحیح اخلاقی
اور عقلی عادات کے ذریعہ جو انجیل ہم میں پیدا کرنا چاہتی ہے فطرت کے بھیدوں
کو کامل طور سے دریافت کر سکتے ہیں۔ کامل اخلاقی تعلق کے ذریعہ یہ سائنس
جو معجزوں کی تردید کرتی ہے انہیں میں اس کی جڑ ہے اگر سائنس کہ ان

کی تاثیر سے الگ کر دیں تو وہ فوراً مرجھا کر سوکھ جائے گی ۔

انجیل کی ایک اور خوبی ہے کہ اس نے لاکھوں کو تسلی اور اطمینان خاطر عطا کر دیا ہے اور یہ خوبی مسیح کے دکھوں میں ہے ۔ مسیح کے دکھ امر واقعی ہیں اور اس کے ذریعہ نوع انسان کے دکھوں پر بہت روشنی پڑتی ہے ۔ ہر قوم اور ہر زمانہ میں جب کسی مرد نے موت کا مقابلہ کیا یا کسی عورت نے دکھ اٹھایا اس یقین پر شہادت دی کہ جب دکھ کو اخلاقی مقصد کے لئے برداشت کرتے ہیں تو لعنت برکت سے بدل جاتی ہے اور اس شخص کو اوروں میں ممتاز کر دیتی ہے ۔ لیکن مسیح کی صلیب کے ذریعہ یہ یقین انسانی فطرت کا ایک لٹلے قانون ثابت ہوا ہے اور مسیح کا تعلق دکھوں کے ساتھ انسانی تجربہ میں ایک تواریخی واقعہ ہے ۔ اس صلیب کے واقعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جو انسان ہمیشہ سے کامل تھا جو راستبازی سے نہایت محبت رکھتا تھا اور الٰہی ارادہ کے ساتھ جس کا کامل اتحاد تھا اس نے اپنے کمال کے لئے سب سے زیادہ دکھ اٹھایا اور انہیں کے ذریعہ سے بیٹے کا جلال جس سے باپ خوش تھا پورے طور سے ظاہر ہوا ۔ آدمی شائد پھر بھی دکھ اور تکلیف کا بھید نہ سمجھے لیکن اتنا تو وہ جان لے گا کہ یہ بلاشک ایک تواریخی واقعہ ہے جس پر سبھوں کے دل شہادت دیتے ہیں کہ وہ اخلاقی اور روحانی شخص جس کا ثانی جہان میں ہوا ہی نہیں نہایت سخت دکھوں اور تکلیفوں کا متحمل ہوا یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ چونکہ اس نے یہ دکھ ہمارے لئے اٹھائے اس لئے اس کی روح کو ان سے تکلیف نہیں پہنچی ۔ بلکہ یہ تکلیف اس کو پہنچی اور اسی وجہ سے وہ ہمارا وکیل ٹھیرا لکھا ہے کہ " وہ خدا کے فضل سے سب آدمیوں کے لئے موت کا مزہ چکھے

کیونکہ اس کو جس کے لئے سب چیزیں ہیں اور جس کے وسیلے ساری چیزیں ہیں یہ مناسب تھا کہ جب بہت سے فرزندوں کو جلال میں لائے ان کی نجات کے پیشوا کو اذیتوں سے کامل کرے کیونکہ وہ جو پاک کرتا اور جو پاک کئے جاتے سب ایک ہی کے ہیں اس لئے وہ انہیں بھائی کہنے سے نہیں شرماتا " وہ دکھ دوسرے دکھوں کی نسبت زیادہ گناہ کا نتیجہ تھے یعنی انسانی فطرت اور کل فطرت کو ملا کر آخری بے انصافی یا ظلم تھا ۔ لیکن چونکہ گناہ اس فطرت کی لعنت کی حیثیت میں موجود تھا جس کو مسیح نے اختیار کیا اس لئے یہ دکھ اس کے کمال کے منکشف کرنے کا وسیلہ تھے اور طہارت کی اس آخری آتش کے ذریعہ اس کی روح کندن کی طرح چمکنے لگی ۔ اس وقت سے لے کر جب کہ ہم رسول کی طرح یہ خواہش رکھتے ہیں کہ خدا کے وارث اور مسیح کے شریک ہوں تو ہمارے دلوں سے یہ آواز نکلتی ہے " اگر ہم دکھ سہینگے تو اس کے ساتھ بادشاہی بھی کرینگے " " ہم اس کے ساتھ دکھ اٹھائیں تاکہ اس کے ساتھ جلال بھی پائیں " ۔ پولس رسول نے ذکر کیا کہ ساری چیزیں گویا مسیح میں جمع ہیں ۔ کیونکہ وہ اس ہی میں جمع ہو سکتی ہیں جس میں نہ صرف خوشی بلکہ ازحد دکھ بھی جمع ہو گئے یعنی صلیب اور قیامت ۔ اس وجہ سے پولس رسول اور اس کے بعد بہت مسیحیوں نے یہ کہا " میری رائے میں زمانہ حال کے دکھ اور اس لائق نہیں کہ اس جلال کے مقابل ہو سکیں جو ہم پر ظاہر ہونے والا ہے " " کیونکہ ہم کو معلوم ہے کہ ساری مخلوقات مل کر اب تک کراہتی ہے اور درد زہ میں پڑی ہے اور نہ فقط وہی بلکہ ہم بھی جنہیں روح کے پہلے پھل ملے ہیں آپ اپنے باطن میں کراہتے ہیں اور لے پالک ہونے یعنی اپنے جسم کے چھٹکارے کی راہ دیکھتے ہیں " ۔ ہمارے بدنوں اور روحوں کا دکھ درد کل خلقت کے دکھ درد کا جز ہے اور یہ دکھ

درد مسیح کی جان کو دکھ بھی ہے۔ اور اگر اُس نے جو کامل روشن ضمیری کے ذریعہ پاکیزگی اور انصاف کو جانتا تھا اور اپنی کامل معصومیت اور دکھوں کی شدت سے واقف تھا اُس خوشی کے لئے جو اُس کے سامنے دھری گئی تھی صلیب کی برداشت کی تو کتنا زیادہ ہم کو یہ یقین ہونا چاہیے کہ "سب چیزیں مل کر خدا سے محبت رکھنے والوں کیلئے بھلائی پیدا کرتی ہیں" زندگی کے اس مسئلہ کا یہ جواب انجیل نے دیا ہے۔ اس بھید کو صاف طور سے منطقی طریقہ پر حل تو نہیں کیا۔ یہ ایمان کو پیش کرتی ہے جو اخلاقی یقین پر مبنی ہے اور ہم سے وہ یہ طلب کرتا ہے کہ معجزوں کے زور پر ہم نہ صرف تابعدار ہوں بلکہ اس زندہ شخص پر توکل کریں اور اس کی پیروی کریں کہ جن باتوں کے بارہ میں وہ ہم سے ایمان طلب کرتا ہے ان کا خود اس نے تجربہ کیا ہے۔

انسان کی اخلاقی فطرت ایک بھید ہے ویسا ہی یہ ایک بھید ہے اور بھید یہ رہیگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایسے بھیدوں کے درمیان سہارا سائنس کے تصورات اور نتائج کی انتظاری سے حاصل ہوتا ہے اور باہم اخلاقی یقین کی بنا پر سے فوراً قبول کرلیں جس پہلو سے اس مسئلہ پر غور کریں عقل حیران ہوتی ہے لیکن اس اثنا میں ایک شخص نمودار ہوتا ہے جو ہمارے دلوں اور کانشنس سے مخاطب ہوتا ہے کمال سچائی راستبازی اور محبت سے اور وہ ہمجنس کی حیثیت اور دکھوں میں شریک ہونے کی حیثیت سے ہم سے التجا کرتا ہے کہ ہم اس پر ایمان لائیں اور جیسا اُس نے یقین رکھا ویسا ہم یقین رکھیں کہ خدا ہماری طرف ہے خواہ باقی سب مخالف ہوں۔ وہ شخص ہمیں ان باتوں کا یقین دلانا چاہتا ہے جس نے نہ صرف موت کا مزہ چکھا بلکہ سارے اخلاقی اور طبعی دکھوں کا مزہ چکھا اور ان پر فتحیاب ہوا اور اپنے دکھوں اور فتحیابی کی بنا پر چاہتا ہے کہ ہم اُس پر بھروسہ رکھیں۔ اس طور پر رسول نے مسیحی عقیدہ کا بیان رومیوں کے خط میں کیا ہے "مسیح کی محبت سے ہم کو کون جدا کریگا"۔ یوں رسول اصور واقعی کی طرف نہ خیالی باتوں کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ یہ محبت الہٰی تو ایک زبردست قوت ہے۔ یہ ازلی روحانی حقیقت ہے۔ پس اس فلک کے زمانہ میں اس محبت پر تکیہ کریں یا دوسرے تجربہ اور عقلی خیالی ڈھکوسلوں کا بھروسہ کریں خدا کرے کہ ان کچھڑوں کے وسیلے اگرچہ میں ان کے نقصوں کے باعث معافی مانگتا ہوں ہمیں پولوس کی طرح یہ کہنے اور ماننے میں مدد ملے "مجھ کو یقین ہے کہ خدا کی جو محبت ہمارے خداوند یسوع مسیح کے وسیلے سے ہے اُس سے ہمکو نہ موت جدا کر سکیگی نہ زندگی نہ فرشتے نہ حکومتیں نہ حال کی نہ استقبال کی چیزیں نہ قدرتیں نہ بلندی نہ پستی نہ کوئی اور مخلوق" ✤

فہرست کتب

معجزات مسیح } جس میں خداوند یسوع مسیح کے معجزات کی مفصل شرح و تفصیل درج ہے اور نیز نصائح اور مفید اشارات جو اُن سے مستنبط ہوتے ہیں اس کے علاوہ (۱۵) مقدمہ میں معجزات کی حقیقت اور امکان وغیرہ پر مفصل اور مدلل بحث کی گئی ہے قیمت مجلد ۱۲/	**گلدستۂ وعظ** } حصہ اول۔ دوم۔ سوم جن میں بزرگان بائیبل اور مسیحی مذہب کے مسائل کے مطابق عالم واعظوں کے وعظ درج کئے گئے ہیں قیمت فی حصہ ۸/
پاسٹر ہشی } جس میں ملک چین کے ایک مسیحی خادم الدین کے حالات جس نے خداوند مسیح کے واسطے اپنی زندگی وقف کرکے بہت کچھ کام کیا۔ قیمت ۶/	**تاویل القرآن** } جس میں قرآن شریف کی صحیح تفسیر کا اصول قائم کرنے کی غرض سے اُس کی تالیف یعنی جمع و ترتیب کی سچی تاریخ بتائی ہے اور ثابت کیا ہے کہ وہ کسی کل کا جزو و متعلقہ ہے جو اپنے معنے بیان کرنے میں یہودیوں اور عیسائیوں کی کتب مقدسہ سے جن کی وہ پوری تصدیق کرتا ہے ہرگز مستغنی نہیں قیمت ۳/
تعلیم نجات } مصنفہ ڈاکٹر ہوپر صاحب۔ جس میں نجات کے بارے میں مسیحی تعلیم کا اس شرح سے مقابلہ کیا گیا ہے جو ہندو اور محمدی مذہب میں پائی جاتی ہے قیمت ۲/	**جولیس کی کشمکش** } یہ ایک قدیم زمانے کا یعنی پہلی مسیحی صدی کے متعلق ایک ناول ہے جس میں اُس زمانے کے لوگوں کا دلچسپ مرقع کھینچا ہے۔ اور ایک نوجوان کی روحانی کشمکش کا حال بیان کرتے ہوئے بہت سے دلچسپ مطالب بیان کردئے ہیں قیمت ۶/